مطالعۂ ادب

(حصۂ اوّل)

برائے زبانِ دوم اُردو

بی۔اے، بی۔ایس سی، بی۔کام (سال اول)

مرتبہ

شعبۂ اُردو، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

ناشر

تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی، حیدرآباد

مطالعۂ ادب (حصۂ اوّل)

مرتبہ شعبۂ اُردو، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

www.urduacademyts.com

مطالعۂ ادب

(حصۂ اوّل)

برائے زبانِ دوم اُردو

بی۔اے، بی۔ایس سی، بی۔کام (سالِ اوّل)

مرتبہ

شعبۂ اُردو، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

ناشر

تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی، حیدرآباد

www.urduacademyts.com

© جملہ حقوق بحق تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی محفوظ ہیں

زیرِ سرپرستی

پروفیسر ایس۔اے۔شکور ڈائرکٹر رسکریٹری تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی

چوتھا ایڈیشن	:	اکٹوبر 2017
تعداد	:	1000 (ایک ہزار)
قیمت	:	-/50 روپئے
طباعت	:	طٰہٰ پرنٹ سسٹمس، لکڑی کا پُل، حیدرآباد۔
کمپوزنگ	:	محمد منہاج الدین 9885683162
نظر ثانی و تصحیح	:	محمد ارشد مبین زبیری
ناشر	:	تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی
		حج ہاؤز، چوتھی منزل، نامپلی، حیدرآباد
		فون : 040-23237810

ملنے کے پتے

☆ دفتر تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی، حج ہاؤز، چوتھی منزل، نامپلی، حیدرآباد۔

☆ اُردو مسکن روبرو چومحلّہ پیالیس، خلوت، حیدرآباد۔

www.urduacademyts.com

پیش لفظ

بی اے ، بی ایس سی، بی کام سالِ اوّل کے طالب علموں کو اُردو زبان دوم کی حیثیت سے تدریس کے مقاصد کے حصول کے لیے ''مطالعۂ ادب''(حصہ اوّل)مرتب کی گئی ہے جس میں شاعری اور نثر کی مختلف اصناف سے طالب علموں کو روشناس کروانے کے لیے اہم متن کے اقتباسات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ قدیم و جدید شعراء اور نثر نگاروں کی تخلیقات سے مناسب انتخاب کے ذریعہ طلباء کے ذوق کی آبیاری کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ شاعری میں غزل، نظم اور نثر میں حکایات، ڈراما، سفرنامہ، سوانح، انشائیہ، افسانہ اور خاکہ اصناف کو شامل کیا گیا ہے۔ ادب پاروں کے انتخاب میں طالب علموں کے معیار اور ان کے ذوق کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ امید ہے کہ ''مطالعۂ ادب'' اُردو زبان دوم کی نصابی کتاب طالب علموں کے لیے دلچسپ اور مفید ثابت ہوگی۔

اس نصاب کی تیاری میں نصابی کمیٹی کے ارکان اور شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ کا مشورہ اور تعاون شامل ہے۔

تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی نے ''مطالعہ ادب'' (حصہ اوّل) کے چوتھے ایڈیشن کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔ میں پروفیسر ایس۔اے شکور ڈائرکٹر/سکریٹری تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کی دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں کیونکہ اس ادارہ کے مالی تعاون کی وجہ سے اس کتاب کی اشاعت کا موقع فراہم ہوا۔

پروفیسر فاطمہ بیگم

سابق صدر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ

حیدرآباد

اکٹوبر 2017ء

www.urduacademyts.com

فہرست

پیش لفظ

حصۂ غزل:

۱) محمد قلی قطب شاہ: 7

(ا) سنو عاقلاں سب کہ دنیا ہے فانی

(ب) مری سانولی من کی پیاری دیسے

۲) ولی دکنی: 10

(ا) پی کے ہوتے نہ کرتوں مہ کی ثنا

(ب) سجن کے باج عالم میں دگر نیں

۳) سراج: 13

(ا) مجکوں یکدم قرار نیں ہرگز

(ب) جو تیرے غم کی تمنا نہ کیا

۴) میر تقی میر: 16

(ا) کوئی نہیں جہاں میں جو اندوہ گیں نہیں

(ب) ہم سے ٹک آگے زمانے میں ہوا کیا کیا کچھ

۵) آتش: 19

(ا) سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا

(ب) خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری

۶) مرزا اسد اللہ خاں غالب: 22

(ا) کوئی دن گر زندگانی اور ہے

(ب) کسی کو دے کے دل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو؟

۷) الطاف حسین حالی: 25

(ا) مجھ میں وہ تاب ضبط شکایت کہاں ہے اب

(ب) دیکھنا ہر طرف نہ مجلس میں

۸) مخدوم: 29

(ا) آپ کی یاد آتی رہی رات بھر

(ب) زندگی موتیوں کی ڈھلکتی لڑی زندگی رنگ گل کا بیاں دوستو

www.urduacademyts.com

حصۂ نظم:

۱) نظیر اکبر آبادی	توحید	33
۲) اکبر الہ آبادی	مستقبل	37
۳) ظفر علی خاں	بارش	40
۴) شیخ محمد اقبال	فنون لطیفہ	42
۵) حفیظ جالندھری	پریت کا گیت	44
۶) ساحر	اے شریف انسانو!	49
۷) شاذ تمکنت	اب کے برس	52

حصۂ نثر:

۱) حکایات	مظہر علی خاں ولا	چند منتخب حکایات	55
۲) ڈراما	امتیاز علی تاج و بیگم قدسیہ زیدی	تلاش	60
۳) سفرنامہ	صالحہ عابد حسین	ہندوستان جنت نشاں	72
۴) سوانح	الطاف حسین حالی	مرزا غالب کے اخلاق و عادات	86
۵) انشائیہ	مشتاق احمد یوسفی	پڑیے گر بیمار	92
۶) افسانہ	قرۃ العین حیدر	یہ غازی یہ ترے پُر اسرار بندے	107
۷) خاکہ	مجتبیٰ حسین	سلیمان اریب	131

☆☆☆

www.urduacademyts.com

www.urduacademyts.com

محمد قلی قطب شاہ

سلطان محمد قلی قطب شاہ، ابراہیم قطب شاہ کا تیسرا فرزنداور سلطنت گولکنڈہ کا پانچواں بادشاہ تھا۔ وہ اپریل ۱۵۶۵ء کو جمعہ کے دن گولکنڈہ میں پیدا ہوا۔ پندرہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔قریب اکتیس (۳۱) سال حکومت کی۔ ۱۶۱۱ء میں اس کا انتقال ہوا۔

محمد قلی قطب شاہ اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے۔ اس کا دیوان اس کے بھتیجے اور داماد سلطان محمد قطب شاہ نے مرتب کیا۔محمد قلی ایک پُرگو اور قادر الکلام شاعر تھا۔ اس کا کلیات قریب پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے جو چار سو سال پہلے کی سماجی دستاویز ہے۔اس نے تقریباً تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی لیکن زیادہ توجہ صنف غزل پر کی۔

محمد قلی کے کلام میں تازگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اسلوب بیان میں سادگی اور روانی ہے۔ اس کے پاس موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔عشق ومحبت کی وارداتوں کے ساتھ سماجی مصروفیات، کھیل کود، موسم غرض زندگی سے تعلق رکھنے والے بے شمار موضوعات اس کے پاس ملتے ہیں۔جن کا بیان اس نے سادگی اورحقیقت پسندی کے ساتھ کیا ہے۔

☆☆☆

www.urduacademyts.com

غزل (۱)

سنو عاقلاں سب کہ دنیا ہے فانی
جو کوئی بوجھیا اُس ہے صاحب قرانی

دنیا رنگ سوں جن بہوت دل نہ باندے
شہاں میں سُہاتا اُسے ..... سلطانی

وہی مرد ہے جے دنیا میانے دین کا
کرے کام ساجے اوسے کامرانی

دیو و جگ کوں بہوجن او بخشش کر و جم
کہ جھمکے گا اُس نور تھے تم پشانی

طمع کوں پیا یاد پانی سوں دھوکر
اپس دل میں تھے ہو بچن کن کہ دھیانی

نبی ہور علی سوں قطبؔ کی ہے پیرت
سدا تو ہیں پایا ہے تختِ شہانی

☆☆☆

www.urduacademyts.com

غزل (۲)

مری سانولی من کی پیاری دیسے
کہ رنگ روپ میں کونلی ناری دیسے

سہے سب سہیلیاں میں بالی عجب
سرو قد ناری اوتاری دیسے

سکیاں میں ڈولے نیہہ بازی سوں جب
او مکھ جوت تھے چند کی خواری دیسے

توں سب میں اُتم تاری تج سم نہیں
کویل تیری بولاں تھے ہاری دیسے

تیری چال نیکی سبھی من کوں بھاے
سکیاں میں توں جوں پُھل بھاری دیسے

بہوت رنگ سوں اپ رنگیاں سکیاں
ولے کاں ترے رنگ کی ناری دیسے

نبی صدقے قطبؔا پیاری سدا
سہیلیاں میں زیبا تماری دیسے

☆☆☆

www.urduacademyts.com

ولی دکنی

ولی محمد نام، ولی تخلص۔ قدیم اُردو کے اکثر و بیشتر شعرا کی طرح ابتدائی حالاتِ زندگی پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اورنگ آباد میں ۱۶۴۸ء یا ۱۶۴۹ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن وہیں گذارا، نوجوانی کے زمانے میں گجرات کا سفر کیا۔

ولی کو حصول علم کی لگن تھی۔ ان کی مذہبی، علمی اور ادبی معلومات بہت وسیع تھیں۔ ان کے کلیات میں تقریباً تمام مروجہ اصنافِ سخن ملتی ہیں۔ چند قدیم اصناف (جن کا چلن اب متروک ہوگیا ہے)بھی ولی کے کلیات میں پائی جاتی ہیں جیسے ثلاثی، چاردرچار، بازگشت وغیرہ۔

ولی کو سیر و سیاحت کا شوق تھا اور ان کے سفر دہلی کا درخشاں پہلو شمالی ہند میں اُردو شاعری کی مقبولیت قرار دیا جاتا ہے۔

ولی کی غزل گوئی کی نمایاں خصوصیت اظہارِ بیان کی سادگی اور حقیقت نگاری ہے۔ ولی کی پرورش صوفیانہ ماحول میں ہوئی۔ وہ خود صوفی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں تصوف کی بڑی اہمیت ہے۔ تصوف کے نکات کے بیان میں انہوں نے بلند تخیل سے کام لیا ہے۔ عشق مجازی اور عشق حقیقی ہر دو کا بیان فن کاری کے ساتھ کیا ہے۔ سادگی، روانی، رنگینی ان کی غزلوں کا وصف ہے۔ تشبیہات، استعارات اور تراکیب میں جدت و معنی آفرینی پائی جاتی ہے۔ ولی کے پاس اخلاقی مضامین بھی ملتے ہیں۔ ولی کا انتقال ۱۷۰۷ء میں ہوا۔

☆☆☆

www.urduacademyts.com

غزل(۱)

پی کے ہوتے نہ کرتوں مہ کی ثنا
معتبر نئیں ہے حسن دور نما

باعث نشہ دو بالا ہے
حسن صورت کے ساتھ حسن ادا

سرخ رویاں منیں سرآمد ہے
تجھ قدم کے اثر سوں رنگ حنا

نئیں ہے گل پی کے مکھ سا عالم میں
قائل اس بات کی ہے بادِ صبا

اے ولؔی مجھ سخن کوں وو بوجھے
جس کوں حق نے دیا ہے فکر رسا

☆☆☆

www.urduacademyts.com

غزل (۲)

سجن کے باج عالم میں دگر نیں
ہمن میں ہے ولے ہم کو خبر نیں
عجب ہمت ہے اس کی جس کوں جگ میں
بغیر از یار دوجے پر نظر نیں
نہ پاوے صندلِ راز الٰہی
جسے گرمی سوں دل کی درد سر نیں
ہوا نیں جب تلک خالی اپس سوں
گرفتاراں میں ہرگز معتبر نیں
اپس کے مدعا کے آشیاں کوں
نہ پہنچے جب تلک ہمت کے پر نیں
نہ پوچھو درد کی بے درد سوں بات
کہے کیا بے خبر جس کوں خبر نیں
ہوا ہوں جیوں کماں خم روز غم سوں
سینے میں تیر ہے آہ جگر نیں
ولؔی اس کی حقیقت کیونکے بوجھوں
کہ جس کا بوجھنا حد بشر نیں

☆☆☆

www.urduacademyts.com

سراجؔ

سید سراج الدین نام، سراجؔ تخلص۔ ۱۷۱۵ء اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ اس دور کے رواج کے مطابق تعلیم و تربیت کا انتظام کیا گیا اور بارہ سال کی عمر میں متداولہ علوم کی تعلیم مکمل کرلی۔ اسی زمانے میں ان پر جذب و مستی کی کیفیت طاری ہوا کرتی اور بے اختیار فارسی اشعار موزوں ہوجاتے۔ گھر سے نکل جاتے اور زیادہ تر وقت شاہ برہان الدین غریب کے مزار پر گذارتے۔

۱۷۳۵ء میں جب کہ سراج کی عمر قریب بیس سال تھی چشتیہ سلسلہ کے بزرگ شاہ عبدالرحمان سے بیعت ہوئے۔ اسی زمانے میں انہوں نے اُردو شاعری کا آغاز کیا اور ۱۷۴۰ء کے بعد اپنے مرشد کے حکم پر شاعری ترک کردی یعنی پانچ چھ سال کی مختصر مدت میں سراج نے اپنا ضخیم کلیات مرتب کرلیا۔

سراج نے کم وبیش تمام اصنافِ شاعری میں طبع آزمائی کی ہے۔ جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے ولی دکنی کے بعد سراج اُردو غزل کے بڑے شاعر کہے جاسکتے ہیں جن کے مرتبے کو ان کا کوئی ہم عصر شاعر نہیں پہنچتا۔ سراج کے کلام کا نمایاں وصف سادگی بیان، سوز و گداز اور تاثر کی فراوانی ہے۔ ان کی غزلوں میں بڑا کیف پایا جاتا ہے۔ جذبے کی شدت اور اسلوب بیان دونوں ہی منفرد ہیں۔

سراج کو صوفی شاعر کہا جاتا ہے۔ وہ مزاجاً اور عملاً صوفی تھے۔ مجازی اور حقیقی دونوں طرح کے عشق کا بیان ان کے پاس ملتا ہے۔ سراج کی شاعری کا اصل محور عشق ہے جس کو وہ خلاصۂ کائنات اور حاصلِ حیات سمجھتے ہیں۔ سراج کے کلام میں روحانی کیفیات اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ نمایاں ہیں۔

☆☆☆

www.urduacademyts.com

غزل (۱)

مجکوں یکدم قرار نیں ہرگز
تجھ بغیر اختیار نیں ہرگز

بزم عشاق میں ارے زاہد
عقل کوں اعتبار نیں ہرگز

آشتابی کہ آج بیکل ہوں
طاقت انتظار نیں ہرگز

سیر کر گلشن محبت کا
گل جنت کوں خار نیں ہرگز

میکشانِ شرابِ وحدت کوں
روزِ محشر خمار نیں ہرگز

کوچہ بے خودی میں مجنوں کوں
سگِ لیلیٰ سیں عار نیں ہرگز

ہجر کی رات میں مثال سراجؔ
اشک غم کا شمار نیں ہرگز

☆☆☆

www.urduacademyts.com

غزل (۲)

جو تیرے غم کی تمنا نہ کیا
ابدی عیش کا سودا نہ کیا
اپنی آنکھوں سیں جو پنہاں نہ ہوا
اس نے کچھ عمر میں پیدا نہ کیا
حیف ہے اس کی تماشا بنی
چشم باطن کوں جو کئی وا نہ کیا
مدتوں لگ حرم و دیر پھرا
میں تیرے واسطے کیا کیا نہ کیا
میں کیا دل کوں گلِ داغ سیں باغ
یار نے عزمِ تماشا نہ کیا
باغ میں نرگسِ بیمار طرف
گوشۂ چشم سیں ایما نہ کیا
جل گیا شوق کے شعلوں میں سراجؔ
اپنی دانست میں بیجا نہ کیا

☆☆☆

www.urduacademyts.com

میر تقی میرؔ

میر محمد تقی نام، میرؔ تخلص۔ ۱۷۲۲ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد علی متقی تھا۔ کم سنی میں ہی والدہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ والد نے تعلیم و تربیت کی ۔ ابھی دس برس کے بھی نہ تھے کہ والد کا بھی انتقال ہوگیا۔ والد کے انتقال کے بعد فکر معاش میں وطن سے دہلی کا رخ کیا۔ صمصام الدولہ تک رسائی ہوئی۔ انہوں نے میر کے لیے ایک روپیہ روزانہ مقرر کردیا لیکن ایک ہی سال بعد صمصام الدولہ مارے گئے۔ نادر شاہ کے حملہ کے بعد دہلی سے اکبر آباد آئے لیکن اطمینان نصیب نہیں ہوا۔ دوبارہ دہلی کا رخ کیا۔ سوتیلے ماموں سراج الدین علی خاں آرزو کے پاس رہنے لگے۔ ادبی فکر اور ذوق کو اس سے کافی فائدہ ہوا۔ سوتیلے بھائی کا برتاؤ میر کے ساتھ ٹھیک نہیں تھا۔ اس لئے کچھ عرصہ بعد یہاں سے بھی الگ ہوگئے۔ خان آرزو کے انتقال کے وقت میر کی شاعری کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی۔ احمد شاہ ابدالی کے حملہ کی وجہ سے دہلی پھر ایک بار تباہ و برباد ہوچکی تھی۔ میر کو دہلی چھوڑ کر لکھنو کا رخ کرنا پڑا۔ نواب اودھ نے قدر و منزلت کی۔ ۱۸۱۰ء میں لکھنو میں انتقال ہوا۔

میر کا ایک فارسی دیوان اور چھ اُردو دیوان ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ بے شمار مثنویاں ، ایک رسالہ فیضِ میرؔ، ایک تذکرہ نکات الشعرا اور سوانح ذکرِ میرؔ ان کی یادگار ہیں۔ تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن غزل گوئی میں غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ ''خدائے سخن'' کہلائے جاتے ہیں۔ان کے اشعار میں سادگی، صفائی، نشتریت، ندرت ، برجستگی پائی جاتی ہے۔تشبیہات ، استعارات اور محاوروں کا استعمال فن کاری کے ساتھ ملتا ہے۔ سوز و گداز ، نرمی و حلاوت اور پرسوز لہجہ ان کی غزل کی ایسی خصوصیات ہیں جس کی نظیر نہیں ملتی۔ تقریباً تمام بڑے اور اہم شعرا نے میرؔ کی استادی کا اعتراف کیا ہے۔

☆☆☆

www.urduacademyts.com

غزل (۱)

کوئی نہیں جہاں میں جو اندوہ گیں نہیں
اس غم کدہ میں آہ دلِ خوش کہیں نہیں

کرتا ہے درد دعوے دریا دلی عبث
دامن نہیں مرا تو میری آستیں نہیں

یہ درد کیونکے اس کے کروں دل نشیں کہ میں
کہتا ہوں جس طرح سے، کہے ہے نہیں نہیں

ماتھا کیا میں صرفِ سجودِ دربتاں
مانند ماہِ نو کے مرے رب جبیں نہیں

گھر گھر ہے ملک عشق میں دوزخ کی تاب و تپ
بھڑکا نہ ہم کو شیخ یہ آتش وہیں نہیں

فکرِ بلند سے میں کیا آسماں اسے
ہر یک سے میرؔ خوب ہو وہ یہ زمیں نہیں

☆☆☆

www.urduacademyts.com

غزل (۲)

ہم سے ٹک آگے زمانے میں ہوا کیا کیا کچھ
تو بھی ہم غافلوں نے آکے کیا کیا کیا کچھ

کیا کہوں تجھ سے کہ کیا دیکھا ہے تجھ میں میں نے
چشمک و غمزہ وہ انداز و ادا کیا کیا کچھ

دل گیا ہوش گیا صبر گیا جی بھی گیا
شغل میں غم کے ترے ہم سے گیا کیا کیا کچھ

نام ہیں خستہ و آوارہ و بدنام مرے
ایک عالم نے غرض مجھ کو کہا کیا کیا کچھ

طرفہ صحبت ہے کہ سنتا نہیں تو میری ایک
واسطے تیرے سنا میں نے، سنا کیا کیا کچھ

حسرتِ وصل و غم ہجر وصالِ رخِ دوست
مر گیا میں پہ مرے دل میں رہا کیا کیا کچھ

تجھ کو کیا بننے بگڑنے سے زمانہ کے کہ یہاں
خاک کن کن کی ہوئی، صرف بنا کیا کیا کچھ

ایک محروم چلے میرؔ ہمیں عالم سے
ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ

☆☆☆

www.urduacademyts.com

آتش

خواجہ حیدر علی نام، آتش تخلص، فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام خواجہ علی بخش تھا۔ کمسنی میں والد کے انتقال کی وجہ سے آتش معقول تعلیم حاصل نہیں کر سکے۔ خاندان میں پیری مریدی کا سلسلہ چلا آرہا تھا لیکن آتش کی طبیعت شعر و شاعری کی طرف راغب تھی۔ اسی لیے انہوں نے مصحفی کی شاگردی اختیار کی اور مشق اور مقدور بھر علمی استعداد کے حصول کے ساتھ مسلم الثبوت استاد ہو گئے۔

اسّی روپے ماہانہ بادشاہ لکھنو سے ملتے تھے لیکن فقر و فاقہ میں زندگی بسر کرنے کے عادی رہے۔ سینکڑوں شاگرد تھے جن میں رند، صبا اور وزیر وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔

آتش رندانہ اور آزادانہ وضع کے آدمی تھے۔ ان کے کلام میں خاص قسم کی بے نیازی ملتی ہے۔ روزمرہ اور بول چال کا لطف کلام میں مزہ پیدا کرتا ہے۔ رنگینی اور شوخی ان کے کلام کی دلکشی دوبالا کرتی ہے۔ اختصار کے ساتھ مضمون کی ادائیگی ان کا نمایاں وصف ہے۔ لکھنو اسکول سے وابستہ چند کمزوریاں بھی ان کی شاعری کا حصہ ہیں۔ عامیانہ خیالات، تصنع، بناوٹ، رعایت لفظی جیسی خصوصیات شاعری میں ملتی ہیں جس سے کیف اور تاثیر میں کمی واقع ہوتی نظر آتی ہے لیکن جہاں کہیں روایتی شاعری سے ہٹ کر انہوں نے سچی شاعری کی طرف توجہ کی۔ اپنا مخصوص انداز پیش کیا ہے۔ مجموعی طور پر بہترین شعرا میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

☆☆☆

www.urduacademyts.com

غزل (۱)

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
قارون نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

زینہ صبا کا ڈھونڈتی ہے اپنی مشتِ خاک
بامِ بلند یار کا ہے آستانہ کیا

طبل و علم ہے پاس نہ اپنے ہے ملک و مال
ہم سے خلاف ہوکے کرے گا زمانہ کیا!

آتی ہے کس طرح سے مری قبضِ روح کو
دیکھوں تو موت ڈھونڈھ رہی ہے بہانہ کیا

بے تاب ہے کمال ہمارا دلِ حزیں
مہماں، سرائے جسم کا ہوگا روانہ کیا؟

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتشؔ غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

☆☆☆

www.urduacademyts.com

غزل (۲)

خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری
خوشا دماغ، جسے تازہ رکھے بو تیری

یقیں ہے اٹکے گی جاں اپنی آکے گردن میں
سنا ہے، جاہے قریب رگِ گلو تیری

پھرے ہیں مشرق و مغرب سے تا جنوب و شمال
تلاش کی ہے صنم ہم نے چار سو تیری

شبِ فراق میں اک دم نہیں قرار آیا
خدا گواہ ہے، شاہد ہے آرزو تیری

دماغ اپنا بھی اے گل بدن! معطر ہے
صبا ہی کے نہیں حصے میں آئی بو تیری

پڑھا ہے ہم نے بھی قرآں، قسم ہے قرآں کی!
جواب ہی نہیں رکھتی ہے گفتگو تیری

یہ گردشِ فلکِ پیر سے ہوا ثابت
قوی، ضعیف کو کرتی ہے جستجو تیری

زمانے میں کوئی تجھ سا نہیں ہے سیف زباں
رہے گی معرکے میں آتشؔ آبرو تیری

☆☆☆

www.urduacademyts.com

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

مرزا اسد اللہ خاں نام تھا۔ پہلے اسدؔ بعد میں غالبؔ تخلص اختیار کیا۔ ۱۷۹۷ء میں اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبداللہ بیگ خاں تھا۔ پانچ برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ چچا نصر اللہ بیگ نے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ ابھی نو برس ہی کے تھے کہ چچا کا بھی انتقال ہوگیا۔ ان کی پنشن سے غالب کو سالانہ سات سو روپے ملتے رہے۔ گیارہ سال کی عمر میں نواب الٰہی بخش کی صاحبزادی سے شادی ہوئی اور دہلی منتقل ہوئے۔ دربار سے تعلق ہوا۔ پچاس روپے ماہوار اور خلعت مقرر ہوئی لیکن غدر کے بعد یہ تنخواہ بھی بند ہوگئی۔ مجبوراً رام پور چلے گئے۔ وہاں سو روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ وطن کی محبت نے وہاں چین سے رہنے نہ دیا۔ دہلی واپس آئے، تین سال کے بعد پنشن جاری ہوگئی۔ ۱۸۶۱ء میں دہلی میں انتقال ہوا۔

مرزا کو فارسی زبان سے بڑی محبت تھی اور فارسی کے بلند پایہ شعراء میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ اُردو میں بھی شاعری کی اور اسی شاعری نے انہیں غیر معمولی مقام و مرتبہ عطا کیا۔ ابتدائی دور کا کلام مشکل اور نامانوس طرز بیان کی وجہ سے نکتہ چینی کا نشانہ بنا۔ رفتہ رفتہ تبدیلی پیدا ہوئی۔ مولوی فضل حق کی دوستی نے ایسا رنگ بدلنے پر مجبور کیا کہ اپنی نظیر آپ ہوگئے۔ مزاج میں انفرادیت تھی۔ ظرافت تھی۔ جدت اور ندرت سے کسی دور کا کلام خالی نہیں۔ خیال میں بلندی معنویت و وسعت پائی جاتی ہے۔ بڑے بڑے مضمون نہایت اختصار کے ساتھ ایک شعر میں نظم کردینے کا ہنر جانتے ہیں۔ حیات و موت، جبر و اختیار، سوز و ساز، گناہ و ثواب، کائنات کے اسرار و رموز غرض بے شمار موضوعات ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ قلبی واردات، تجربات اور مشاہدات کی وہ بہترین مرقع کشی کرتے ہیں۔ ان کی شہرت و مقبولیت میں کسی زمانے میں کمی نہیں ہوئی۔

☆☆☆

www.urduacademyts.com

غزل (۱)

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں؟
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے
بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے
دے کے خط، منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے
قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلائے آسمانی اور ہے
ہوچکیں غالبؔ! بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

☆☆☆

غزل (۲)

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو؟
نہ ہو جب دل ہی سینے میں، تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو؟
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں؟
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ''ہم سے سرگراں کیوں ہو؟''

www.urduacademyts.com

کیا غمخوار نے رُسوا، لگے آگ اس محبت کو!
نہ لاوے تاب جو غم کی، وہ میرا راز داں کیوں ہو؟
وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل! تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟
قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم!
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟
یہ کہہ سکتے ہو ''ہم دل میں نہیں ہیں؟'' پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو، تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو؟
غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ ، دیکھو، جرم کس کا ہے!
نہ کھینچو گر تم اپنے کو، کشاکش درمیاں کیوں ہو؟
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے؟
ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو؟
یہی ہے آزمانا، تو ستانا کس کو کہتے ہیں؟
عدو کے ہولیے جب تم، تو میرا امتحاں کیوں ہو؟
کہا تم نے کہ ''کیوں ہو غیر کے ملنے میں رُسوائی؟''
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ''ہاں، کیوں ہو؟''
نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو، غالبؔ!
ترے بے مہر کہنے سے ، وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو؟

☆☆☆

www.urduacademyts.com

الطاف حسین حالؔی

خواجہ الطاف حسین نام، حالؔی تخلص ۔ والد کا نام خواجہ ایزدبخش ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے، نوسال کی عمر میں والد کے سایہ سے محروم ہوگئے۔ بڑے بھائی اور بہن نے تعلیم و تربیت کی۔ قرآن شریف حفظ کرکے عربی و فارسی کی تعلیم شروع کی۔ حصول علم میں مشغول تھے کہ سترہ سال کی عمر میں شادی کردی گئی۔ تحصیل علم میں ازدواجی زندگی کو حائل پایا تو پوشیدہ طور پر پانی پت سے دہلی چلے گئے۔ بیوی کے گھر والے خوش حال تھے۔ اس لیے دہلی میں مولوی نوازش علی سے عربی علوم کی تحصیل میں مشغول ہوئے۔ ڈیڑھ سال بعد عزیزوں کے اصرار پر وطن لوٹے۔ یہاں بھی تحصیلِ علم میں منہمک رہے۔ ۱۸۵۷ء میں کلکٹری میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں پھر وطن لوٹنا پڑا۔ کئی سال بے کاری میں گزرے۔ ۱۸۶۲ء میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے انہیں اتالیق مقرر کیا۔ شیفتہ بڑے علم دوست اور خوش ذوق شاعر تھے۔ حالی کو اسی اثنا میں غالب سے بھی نیاز حاصل ہوا اور وہ ان کے عقیدت مند شاگرد بن گئے۔ شیفتہ کے انتقال کے بعد حالی لاہور چلے گئے۔ جہاں انہیں گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازمت مل گئی۔ لاہور سے پھر دلی چلے آئے اور عربک اسکول میں مدرس ہوئے۔

www.urduacademyts.com

۱۸۷۷ء میں حکومت حیدرآباد نے قدر دانی کے طور پر حالی کے نام تاحیات پچھتر روپے ماہانہ مقرر کیا جو بعد میں سو روپے کر دیا گیا۔ اس وظیفے کے سبب حالی کو اطمینان کے ساتھ علمی کام انجام دینے کا موقع مل گیا۔ اور ہمہ تن تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔

قیامِ پنجاب کے زمانے میں کرنل ہال رائیڈ کی تحریک پر محمد حسین آزاد اور حالی نے مل کر ایک نئی طرز کے مشاعرے کی بنا ڈالی جس میں مصرعِ طرح کے بجائے نظم کے لیے عنوان تجویز کیا جاتا تھا۔ ان مشاعروں نے اردو نظم نگاری کو فروغ دینے میں بڑا حصہ لیا۔ حالی نے ۱۹۱۷ء میں انتقال کیا۔

حالی بہ یک وقت شاعر، مقالہ نگار، سوانح نگار اور نقاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ان شعرا میں ہیں جنہوں نے غزل اور نظم دونوں میں بہت بلند مقام حاصل کیا۔ انہوں نے اردو شاعری میں نظم کو رواج دینے میں بھی بڑا حصہ ادا کیا اور اپنی نظم گوئی کے ذریعہ اردو شاعری کو وسعت دی۔ اردو شاعری حالی سے پہلے بڑی حد تک حسن و عشق کے دائرے میں محدود تھی لیکن حالی نے اس میں ہر قسم کے موضوعات داخل کیے۔ ان کا اندازِ بیان صاف و سلیس ہے۔ سیدھے سادھے الفاظ استعمال کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا کلام متاثر کن ہے۔

☆☆☆

www.urduacademyts.com

غزل (۱)

مجھ میں وہ تابِ ضبطِ شکایت کہاں ہے اب
چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی منہ میں زباں ہے اب

وہ دن گئے کہ حوصلۂ ضبطِ راز تھا!
چہرے سے اپنے شورشِ پنہاں عیاں ہے اب

جس دل کو قید ہستیٔ دنیا سے ننگ تھا
وہ دل اسیرِ حلقۂ زلفِ بتاں ہے اب

آنے لگا جب اُس کی تمنا میں کچھ مزا
کہتے ہیں لوگ جان کا اس میں زیاں ہے اب

لغزش نہ ہو بلا ہے حسینوں کا التفات
اے دل سنبھل وہ دشمن دیں مہرباں ہے اب

اک جُرعۂ شراب نے سب کچھ بھلادیا
ہم ہیں اور آستانۂ پیرِ مغاں ہے اب

ہے وقتِ نزع اور وہ آیا نہیں ہنوز
ہاں جذبِ دل مدد کہ دم امتحاں ہے اب

ہے دل غم جہاں سے سبکدوش ان دنوں
سر پڑتا، سوجھتا کوئی بارِ گراں ہے اب

حالؔی تم اور ملازمت پیرِ مے فروش
وہ علمِ دیں کدھر ہے وہ تقویٰ کہاں ہے اب

☆☆☆

www.urduacademyts.com

غزل (۲)

دیکھنا ہر طرف نہ مجلس میں
رخنے نکلیں گے سیکڑوں اس میں
ہو نہ بینا تو فرق پھر کیا ہے
چشمِ انسان و چشمِ نرگس میں
بے قدم دم ہیں خانقاہوں میں
بے عمل علم ہیں مدارس میں
دین اور فقر تھے کبھی کچھ چیز
اب دھرا کیا ہے اُس میں اور اِس میں
جس سے نفرت ہے اہل نعمت کو
وہی نعمت ہے چشم مفلس میں
ہو فرشہ بھی تو نہیں انسان
درد تھوڑا بہت نہ ہو جس میں
جانور، آدمی، فرشتہ، خدا
آدمی کی ہیں سیکڑوں قسمیں
آج کل چرخ صلح جو ہے بہت
دیکھئے ہو بگاڑ کس کس میں
کی ہے خلوت پسند حالؔی نے
اب نہ دیکھو گے اس کو مجلس میں

☆☆☆

www.urduacademyts.com

مخدومؔ

مخدوم محی الدین نام، مخدومؔ تخلص میدک کے ایک گاؤں اندول میں 4فروری 1908ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا نام غوث محی الدین تھا۔ کم سنی میں والد کے انتقال کی وجہ چچا مولوی رشید الدین صاحب کی زیرِ نگرانی تعلیم حاصل کی۔ چچا کے تبادلوں کی وجہ مختلف مقامات پر زیرِ تعلیم رہے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے عثمانیہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ 1936ء میں ایم اے اُردو کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ ملازمت کی ابتداء کلرکی سے ہوئی۔ بعد میں سٹی کالج حیدرآباد میں اُردو کے لکچرر مقرر ہوئے۔

مخدوم دورانِ تعلیم کمیونسٹ نظریات سے متاثر ہوئے۔ مزدوروں کی فلاح اور بہبود کے لیے کام کیا۔ اس میں بڑھتی مصروفیت نے ملازمت سے استعفیٰ دینے پر مجبور کیا۔

دورانِ تعلیم مخدوم نے شاعری شروع کی اور بطور شاعر جلد ہی اپنی منفرد شناخت بنالی۔ انہوں نے ڈرامے بھی لکھے اسٹیج کیے۔ ایم اے کے لیے ڈرامہ پر تحقیقی مقالہ بھی تحریر کیا لیکن بطور شاعر ان کا مرتبہ زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ نظم اور غزل دونوں میں ان کی نگارشات ملتی ہیں۔ سرخ سویرا اور گل تر دو شعری مجموعے ہیں۔ بساطِ رقص کے نام سے ایک اور شعری مجموعہ شائع ہوا ہے۔ جس میں پہلے دو مجموعوں کے کلام کو شامل کیا گیا ہے۔ مخدوم کا انتقال 25اگست 1969ء کو ہوا۔

مخدوم کی شاعری میں سلاست، روانی اور بہاؤ کی سی کیفیت نظر آتی ہے۔ ذاتی تجربات، مشاہدات اور جذبات کا اظہار، فن کاری اور اثر آفرینی کے ساتھ ملتا ہے۔ آہنگ اور انداز منفرد اور پُر اثر ہے۔

☆☆☆

www.urduacademyts.com

غزل (۱)

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر
چشمِ نم مسکراتی رہی رات بھر

رات بھر درد کی شمع جلتی رہی
غم کی لو تھرتھراتی رہی رات بھر

بانسری کی سریلی سنہری صدا
یاد بن بن کے آتی رہی رات بھر

یاد کے چاند دل میں اترتے رہے
چاندنی جگمگاتی رہی رات بھر

کوئی دیوانہ گلیوں میں پھرتا رہا
کوئی آواز آتی رہی رات بھر

☆☆☆

www.urduacademyts.com

غزل (۲)

زندگی موتیوں کی ڈھلکتی لڑی زندگی رنگِ گل کا بیاں دوستو
گاہ روتی ہوئی گاہ ہنستی ہوئی، میری آنکھیں ہیں افسانہ خواں دوستو

ہے یہ اُس کے جمالِ نظر کا اثر، زندگی زندگی ہے، سفر ہے سفر
سایۂ شاخ گل، شاخِ گل بن گیا۔ بن گیا ابر، ابرِ رواں دوستو

زندگی اک مہکتی ہوئی رات ہے، لڑکھڑاتی نگاہوں کی سوغات ہے
پنکھڑی کی زبان، پھول کی داستان، اس کے ہونٹوں کی پرچھائیاں دوستو

کیسے طے ہوگی یہ منزلِ شامِ غم، کس طرح سے ہو دل کی کہانی رقم
اک ہتیلی میں دل، اک ہتیلی میں جاں، اب کہاں کا یہ سودو زیاں دوستو

دوستو ایک دوجام کی بات ہے، دوستو ایک دو گام کی بات ہے
ہاں اُسی کے درو بام کی بات ہے بڑھ نہ جائیں کہیں دوریاں دوستو

سن رہا ہوں حوادث کی آواز کو، پارہاہوں زمانے کے ہر راز کو
دوستو اٹھ رہا ہے دلوں سے دھواں، آنکھ لینے لگی ہچکیاں دوستو

☆☆☆

www.urduacademyts.com

www.urduacademyts.com

نظیر اکبر آبادی

نظیر اکبر آبادی کا پورا نام سید ولی محمد اور تخلص نظیر تھا۔ ان کا تعلق خاندان قریش سے تھا۔ والد کا نام سید محمد فاروق تھا۔ نظیر دہلی میں پیدا ہوئے ۔ ان کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں اختلاف رائے ہے۔ مختلف بیانات کی روشنی میں اتنا کہا جاسکتا ہے کہ نظیر اکبر آبادی ۱۷۳۵ء سے لے کر ۱۷۴۱ء کے کسی درمیانی سال میں پیدا ہوئے۔ نظیر ابھی کم سن ہی تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا اور جب باشعور ہوئے تو ترکِ وطن پر مجبور ہوگئے کیوں کہ دہلی نادرشاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کی وجہ سے تباہ و برباد ہوگئی تھی۔ اوروں کی طرح دہلی کی مصیبتوں نے انہیں بھی چین سے رہنے نہ دیا۔ نظیر گوشہ عافیت کی تلاش میں نانی اور ماں کو لے کر اپنے ننھیال اکبر آباد روانہ ہوئے اور اپنی تمام تر زندگی یہیں بسر کردی۔ اسی لیے اکبر آبادی کہلائے۔ ان کے لیے یہاں کا ماحول نہایت سازگار ہوا۔ نظیر کی شاعری کی ابتداء اور شہرت دونوں اکبر آباد کی مرہونِ منّت ہے۔ یہ فطری شاعر تھے۔ اصلاحِ سخن کسی سے بھی لینا گوارہ نہ کی۔

کلیات نظیر میں حمد، نعت، منقبت، غزل، مخمس، شہر آشوب سب کچھ شامل ہیں۔ لیکن ان کا مرتبہ بہ حیثیت نظم گو اردو شاعری میں منفرد ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اردو میں نظم نگاری کا آغاز نظیر اکبر آبادی سے ہی ہوتا ہے کیوں کہ انہوں نے ایسے دور میں نظم گوئی اختیار کی جب کہ غزل کا رواج تھا۔ انہوں نے اپنی شاعری کا مواد انسان اور اس کی روزمرہ زندگی سے لیا ہے ان کی شاعری ہندوستانی تہذیب وتمدن کی آئینہ دار ہے۔ نظیر کو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت ہے۔ ذخیرۂ الفاظ کی کمی نہیں ہے۔ وہ ہر منظر اور ہر کیفیت کا نقشہ پیش کرجاتے ہیں۔ عوام اور مقامی الفاظ ومحاوروں کو انہوں نے بڑی ہی بے تکلفی اور روانی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اسی وجہ سے ان کو پہلا عوامی شاعر یا جمہوری شاعر بھی کہا گیا ہے۔

☆☆☆

www.urduacademyts.com

توحید

تنہا نہ اُسے اپنے دلِ تنگ میں پہچان
ہر باغ میں، ہر دشت میں، ہر سنگ میں پہچان
بے رنگ میں، یا رنگ میں، نیرنگ میں پہچان
منزل میں، مقامات میں، فرسنگ میں پہچان
نت روم میں اور ہند میں اور زنگ میں پہچان
ہر راہ میں، ہر ساتھ میں، ہر سنگ میں پہچان
ہر عزم ارادے میں، ہر آہنگ میں پہچان
ہر دھوم میں، ہر صلح میں، ہر جنگ میں پہچان

ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے، تو دلبر کو ہر اِک رنگ میں پہچان

پھل پات، کہیں شاخ، کہیں پھول، کہیں بیل
نرگس کہیں، سوسن کہیں، بیلا کہیں رابیل
آزاد کوئی سب سے، کسی کا ہے کہیں میل
ملتا ہے کوئی راکھ، چنبیلی کا کوئی تیل
کرتا ہے کوئی، ظلم کوئی لیتا ہے جھیل
باندھے کہیں تلوار، اُٹھاتا ہے کوئی سیل
ادنیٰ کوئی، اعلا کوئی، سوکھا کوئی، دنڑ پیل
جب غور سے دیکھا، تو اُسی کے ہیں یہ سب کھیل

ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے، تو دلبر کو ہر اِک رنگ میں پہچان

گاتا ہے کوئی شوق میں، کرتا ہے کوئی حال
چھانے ہے کوئی خاک، اُڑاتا ہے کوئی مال
ہنستا ہے کوئی شاد، کسی کا ہے بُرا حال
روتا ہے کوئی، ہو کے غم و درد میں پامال
ناچے ہے کوئی شوخ، بجاتا ہے کوئی گال
پہنے ہے کوئی چیتھڑے اوڑھے ہے کوئی شال
کرتا ہے کوئی ناز، دکھاتا ہے کوئی حال
جب غور سے دیکھا، تو اُسی کی ہے یہ سب چال

ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے، تو دلبر کو ہر اِک رنگ میں پہچان

www.urduacademyts.com

جاتا ہے حرم میں کوئی قُرآن بغل مار　　کہتا ہے کوئی دیر میں پوتھی کے سماچار
پہنچا ہے کوئی پار، بھٹکتا ہے کوئی وار　　بیٹھا ہے کوئی عیش میں پھرتا ہے کوئی زار
عاجز کوئی، بے کس کوئی، ظالم کوئی لٹھ مار　　مفلس کوئی نادار، تونگر کوئی زردار
زخمی کوئی، ماندہ کوئی، اچھا کوئی بدکار　　جب غور سے دیکھا تو اُسی کے ہیں سب اسرار

ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے، تو دلبر کو ہر اِک رنگ میں پہچان

ہے کوئی دلی دوست، کوئی جان کا دُشمن　　بیٹھا ہے پہاڑوں میں، کوئی پھرتا ہے بن بن
مالا کوئی جپتا ہے، کوئی شوق میں سمرن　　چھوڑے ہے کوئی مال، سمیٹے ہے کوئی دھن
نکلے ہے جواہر کے کوئی پہن کے ابرن　　لوٹے ہے کوئی خاک میں رورو کے ملا تن
جوگی کوئی بھوگی کوئی ، اگی کوئی سوگن　　جب غور سے دیکھا تو اُسی کے ہیں یہ سب فن

ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے، تو دلبر کو ہر اِک رنگ میں پہچان

سردی کہیں، گرمی کہیں، جاڑا کہیں برسات　　دوزخ کہیں، بیکنٹھ کہیں ارض و سماوات
حوریں کہیں، غلماں کہیں پریاں کہیں جنات　　اوجڑ کہیں بستی، کہیں جنگل، کہیں دیوات
سختی کہیں راحت ،کہیں گردش، کہیں سکنات　　شادی کہیں، ماتم کہیں نور اور کہیں ظلمات
تارے کہیں،سورج کہیں، بُرج اور کہیں دن رات　　جب غور سے دیکھا تو اُسی کے ہیں طلسمات

ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے، تو دلبر کو ہر اِک رنگ میں پہچان

بیچے ہے جواہر کوئی زر، سیم و طلا رانگ　　مارے کوئی پارے کو، بناوے کوئی مرگانگ
دیتا ہے کوئی ہاتھ سے، لیتا ہے کوئی مانگ　　محتاج کوئی قوت کا، رکھتا ہے کوئی دانگ

www.urduacademyts.com

ٹھہرا ہے کوئی چور، لگاتا ہے کوئی تھانگ مَلتا ہے کوئی پوست کو، چھانے ہے کوئی بھانگ
گھنٹہ ہے کہیں جھانجھ، کہیں سنکھ، کہیں مانگ جب غور سے دیکھا تو اُسی کے ہیں یہ سب سوانگ

ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے، تو دلبر کو ہر اِک رنگ میں پہچان

ناری کوئی باری، کوئی خاکی، کوئی آبی صوفی کوئی زاہد، کوئی بدمست شرابی
باتیں کوئی بیٹھا ہوا کرتا ہے کتابی پیتا ہے کوئی کیف، کوئی مے کی گلابی
مارے ہے زٹل کوئی، کہیں جیب ہے دابی سچا، کوئی جھوٹا ہے، کوئی رند خرابی
کالا کوئی گورا، کوئی پیلا، کوئی آبی ہیں اُس کی ہی قدرت کے یہ سب لال گلابی

ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے، تو دلبر کو ہر اِک رنگ میں پہچان

کیا حُسن کہیں پایا ہے! اللہ ہی اللہ! کیا عشق کہیں چھایا ہے! اللہ ہی اللہ!
کیا رنگ یہ رنگوایا ہے! اللہ ہی اللہ! کیا نور یہ جھمکایا ہے! اللہ ہی اللہ!
کیا دھوپ ہے، کیا سایا ہے! اللہ ہی اللہ! کیا مہر ہے، کیا مایا ہے! اللہ ہی اللہ!
کیا ٹھاٹھ یہ ٹھہرایا ہے! اللہ ہی اللہ! کیا بھید نظیرؔ آیا ہے! اللہ ہی اللہ!

ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے، تو دلبر کو ہر اِک رنگ میں پہچان

☆☆☆

www.urduacademyts.com

اکبرؔ الہٰ آبادی

سید اکبر حسین نام اکبر تخلص ۱۸۴۶ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میر تفضّل حسین تھا۔ اس دور کے مطابق تعلیم و تربیت کا انتظام کیا گیا۔ اپنی ذہانت کی وجہ سے ہمیشہ اپنے درجوں میں ممتاز رہے۔ مختاری کا امتحان کامیاب کر کے نائب تحصیلدار ہوگئے۔ وکالت کا امتحان پاس کر کے منصف ہوگئے اور بطور جج خدمات انجام دیں۔

شعرو شاعری سے بچپن سے ہی دلچسپی رہی۔ خواجہ آتش کے شاگرد وحیدالدین وحیدؔ کے شاگرد تھے۔ ابتدائی دور کے کلام میں مقررہ مضامین کو سیدھے سادھے انداز میں نظم کرنے کا رجحان ملتا ہے۔ بعد میں قدیم طرز فکر میں شوخی و ظرافت کا عنصر غالب آتا گیا۔

ملک اور قوم کی حالت دیکھ کر ان کا دل بھر آیا۔ انہوں نے طنز آمیز باتیں نظم کر کے دلوں کو اصلاح پر مائل کرنے کی کوشش کی۔ اکبر مغرب کی کورانہ تقلید کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اہل مشرق کو وہ اس بات کا مشورہ دیتے نظر آتے ہیں کہ وہ جوہر پیدا کرو جس سے خود کی اور ملک کی حالت میں بہتری پیدا ہو۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ ان کی نصیحت ناخوشگوار نہیں معلوم ہوتی۔

انہوں نے اپنے ماحول کی ترجمانی اور سماج کی درستی اپنی شاعری کے ذریعے انجام دینے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی رہے۔

ادبی نقطہ نظر سے ان کے کلام کا جائزہ بتاتا ہے کہ سلاست، روانی، معنی آفرینی، موثر انداز بیاں ان کی شاعری کی عام خصوصیات رہی ہیں اور یہ انہیں تاریخ ادب کا ایک اہم حصہ بناتی ہیں۔

☆☆☆

www.urduacademyts.com

مستقبل

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی، اور نئے ساماں بہم ہوں گے

نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی
نہ ایسا پیچ زلفوں میں، نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے

نہ ناخاتونوں میں رہ جائے گی یہ پردے کی پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہوں گے

بدل جائے گا اندازِ طبائع دور گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسباب غم ہوں گے

خبر دیتی ہے تحریک ہوا تبدیل موسم کی
کِھلیں گے اور ہی گل، زمزمے بلبل کے کم ہوں گے

عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملّت سے
نیا کعبہ بنے گا، مغربی پتلے صنم ہوں گے

بہت ہوں گے مغنّی نغمۂ تقلیدِ یورپ کے
مگر بے جوڑ ہوں گے، اس لئے بے تال وسم ہوں گے

ہماری اصطلاحوں سے زبان نا آشنا ہوگی
لغاتِ مغربی بازار کی بھاشا سے ضم ہوں گے

www.urduacademyts.com

بدل جائے گا معیارِ شرافت چشم دنیا میں
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے

گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے
کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہوں گے

کسی کو اس تغیر کا نہ دُکھ ہوگا نہ غم ہوگا
ہوئے جس ساز سے پیدا، اُسی کے زیر و بم ہوں گے

تمہیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبؔر!
بہت نزدیک ہے وہ دن، نہ تم ہوگے، نہ ہم ہوں گے

☆☆☆

www.urduacademyts.com

ظفر علی خاں

۱۸۷۰ء میں سیالکوٹ کے ایک گاؤں کوٹ مہرتھ میں پیدا ہوئے۔ پٹیالہ سے دسواں درجہ پاس کرنے کے بعد علی گڑھ آئے اور یہاں سے ۱۸۹۲ء میں ایف،اے کا امتحان پاس کر کے محکمہ ڈاک و تار میں نوکری کر لی مگر یہ نوکری زیادہ دن تک قائم نہ رہی چھوڑ کر پھر علی گڑھ واپس آئے اور پھر پڑھنا شروع کیا۔ بی۔ اے پاس کر کے محسن الملک کے پرائیوٹ سکریٹری ہو گئے۔

ظفر علی خاں کی گونا گوں صلاحیتیں ان کو میدان سیاست میں لے آئیں۔ اس محاذ پر انہوں نے بڑی جلدی نمایاں حیثیت حاصل کر لی کیونکہ وہ خطیب بھی تھے، ادیب بھی، شاعر بھی تھے، صحافی بھی، صاحب دماغ بھی تھے اور سپاہی بھی۔ ملکی اور قومی خدمات کے لئے اپنے کو وقف کر دیا تھا۔ تحریک خلافت کے سلسلہ میں ان کو پانچ سال کی سزا ہوئی اور پھر مختلف اوقات میں سامراجی حکومت سے مقابلہ کرنے میں متعدد بار جیل جانا پڑا، جوڑا جائے تو آپ کی جملہ میعاد قید بارہ سال سے کم نہ ہوگی۔ طویل علالت کے بعد ۱۹۵۶ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

آپ کا قلم شعر و شاعری کی دنیا میں بھی رواں رہتا ہے، نظموں کا ایک مجموعہ بہارستان شائع ہو چکا ہے جس میں زیادہ تر سیاسی و مذہبی نظمیں ہیں۔ تشبیہ و استعارے کی جدت، بیان کی برجستگی، خیال کا واضح طور پر چند الفاظ میں ادا کرنا ایسی خوبیاں ہیں جو ظفر علی خاں کو ایک خاص طرز تحریر کا مالک بنا دیتی ہیں، زبان میں عموماً روانی ہوتی ہے، زور اور تاثیر کی بھی کمی نہیں، زبان کسی قدر عالمانہ ہے اور یہ رنگ ہر جگہ نمایاں ہے۔

☆☆☆

www.urduacademyts.com

بارش

ابر تھا چھایا ہوا اور فصل تھی برسات کی
تھی زمیں پہنے ہوئے وردی ہری بانات کی
آفتاب اوڑھے ہوئے تھا چادرِ ابرِ سیاہ
برق کی چشمک زنی سے خیرہ ہوتی تھی نگاہ
بادل اتنے میں دُرناسفتہ برسانے لگے
داستانِ قلزم و عماں کو دُہرانے لگے
جھوم کر اُٹھی گھٹا۔ برسی برس کر پھٹ گئی
گرد کی چادر زمیں کے منہ سے فوراً ہٹ گئی
بادلوں سے نورِ خورشید اِس طرف چھننے لگا
سائباں قوسِ قزح کا اُس طرف بننے لگا
سبزہ زاروں میں کلیلیں کرتے پھرتے تھے ہرن
تھا مہابن کا ہر اک کو ناختن اندر ختن
جنگلوں میں مست ہوکر ناچتے پھرتے تھے مور
کوہساروں میں چکوروں نے مچا رکھا تھا شور
ڈھل کے پہنچا تھا افق کے آسماں تک آفتاب
تھی شفق کی اس کے منہ پر ایک نارنجی نقاب
یہ نظر آرا مناظر تھے کچھ ایسے دل فریب
ہاتھ سے جاتا رہا دل میرے اور دل سے شکیب
عالم از خود رفتگی کا مجھ پہ طاری ہوگیا
جوش مستی کامری ہر رگ میں ساری ہوگیا

☆☆☆

www.urduacademyts.com

شیخ محمد اقبالؔ

شیخ محمد اقبال نام، سر خطاب، تخلص اقبالؔ۔ ۱۸۷۳ء سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ مکتب میں ابتدائی تعلیم کے بعد اسکاچ مشن اسکول سیال کوٹ میں داخل ہوئے۔ یہاں شمس العلماء مولانا میر حسن عربی اور فارسی کے استاد تھے۔ اقبال نے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحان وہیں سے پاس کیے۔ ۱۸۹۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور ۱۸۹۹ء میں فلسفے میں ایم اے کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے اور وہاں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک رہے۔ اسی دوران میونخ یونیورسٹی (جرمنی) سے ۱۹۰۷ء میں فلسفہ عجم کے موضوع پر تحقیقی کام کرکے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد ۱۹۰۸ء میں لندن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔

اقبال اپنی تعلیمی، علمی و عملی زندگی میں دو اساتذہ سے بے حد متاثر رہے۔ ایک تو مولانا میر حسن ، دوسرے گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر تھامس آرنلڈ۔ انگلستان جانے سے پہلے اقبال اورینٹل کالج لاہور میں استاد کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۰۸ء میں یورپ سے واپسی پر وکالت کو مستقل طور پر ذریعہ معاش بنایا۔ البتہ جزوقتی استاد کی حیثیت سے گورنمنٹ کالج لاہور میں بھی پڑھاتے رہے۔ ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔

اقبالؔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے اولین نقیبوں میں سے ہیں۔ ان کی قومی اور وطنی نظمیں صرف اردو میں ہی نہیں بلکہ ساری ہندوستانی زبانوں کی قومی شاعری کا قابل فخر سرمایہ سمجھی جاتی ہیں۔ اقبالؔ پہلے پیامبر شاعر ہیں۔ انہوں نے ایک منظّم اور مبسوط فلسفۂ حیات اپنی شاعری کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ اردو شاعری میں اقبالؔ کی منفرد خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے فلسفیانہ فکر کو اعلیٰ ترین شعریت سے ہم آہنگ کردیا ہے۔ اقبالؔ کی فکر کی

www.urduacademyts.com

آفاقیت اور فن کی پختہ کاری انہیں دنیا کے عظیم شعرا کی صف میں کھڑا کرتی ہے۔ وہ عظمت انسان کے سب سے بڑے نقیب تھے۔

اقبالؔ کی شاعری اور فلسفہ کا محور خودی، عشق اور عمل ہے۔ ان موضوعات کو انہوں نے جس شاعرانہ کمال کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ انہیں اردو شاعری میں عظمت اور احترام کے اس مقام پر پہنچا دیتا ہے جہاں بہت کم شاعروں کی رسائی ہوتی ہے۔

اردو میں اقبالؔ کے تین مجموعۂ کلام ملتے ہیں۔ بانگ درا۔ بال جبریل، ضرب کلیم۔ اس کے علاوہ ارمغانِ حجاز میں اردو اور فارسی دونوں کلام شامل ہیں۔ فارسی کلام کے مجموعوں میں اسرار خودی، رموز بے خودی، پیام مشرق، زبورِعجم، جاوید نامہ، مسافر، پس چہ آید باید کرد، اے اقوام مشرق شامل ہیں۔ اردو نثر میں اقبال کے مکاتیب بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے انگریزی اور جرمن زبانوں میں فلسفیانہ موضوعات پر اہم مقالے اور کتابیں تصنیف کی ہیں۔

☆☆☆

فنونِ لطیفہ

اے اہل نظر! ذوق نظر، خوب ہے لیکن
جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے، وہ نظر کیا؟

مقصودِ ہنر، سوز حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس، یا دو نفس ، مثل شرر کیا؟

جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں! وہ صدف کیا؟ وہ گہر کیا؟

شاعر کی نوا ہو؟ کہ مغّنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو، وہ باد سحر کیا؟

بے معجزہ دنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا، وہ ہنر کیا؟

☆☆☆

www.urduacademyts.com

حفیظؔ جالندھری

حفیظؔ جالندھری ۱۹۰۰ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے، بہت قلیل عرصہ میں حفیظؔ نے اپنی شاعری کا سکہ ملک میں رواں کردیا، شاہنامۂ اسلام لکھ کر ایک خاص شہرت کے مالک ہوگئے، کلام کو قبولِ عام کا شرف حاصل ہوچکا ہے، فردوسی نے محمود غزنوی کے اشارے سے شاہنامہ لکھ کر ایران کے بادشاہوں کی عظمتوں کو پھر سے زندہ کرنے کی جو کامیاب کوشش کی تھی وہ سب پر ظاہر ہے، حفیظؔ نے اپنے مذہبی جذبات سے متاثر ہوکر اسلام کی گزشتہ عظمت و خدمات کو ازسرنو دنیا کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جس میں شاعرانہ حیثیت سے بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں، بیانیہ شاعری اور وہ بھی تاریخی و روایتی واقعات کو نظم کرنا اور خشکی و نثریت سے محفوظ رکھنا آسان نہیں، فنکاری کے ساتھ ساتھ ایک خاص آن بان اس کام کے لئے درکار ہے، حفیظؔ قابل ستائش ہیں کہ اس مہم کو بڑی خوبی سے سر کر گئے ہیں، تمام کلام میں شعریت نمایاں ہے، اسلامی جوش جابجا زور وفخر کی لہر بھی دوڑا دیتا ہے، جس سے کلام میں ایک عظمت و دلکشی پیدا ہوجاتی ہے، واقعات دلچسپ ہوجاتے ہیں اور بیانات پُر اثر۔

شاہنامہ اسلام کے علاوہ ان کی نظموں کے اور مجموعے بھی شائع ہوچکے ہیں، مثلاً نغمۂ زار، سوز و ساز، جن میں علاوہ اور خوبیوں کے سب سے نمایاں خوبی کیف و روانی کی ہے، جس کے بہاؤ میں پڑھنے والا خود بہہ جاتا ہے، ان خصوصیات کو بااثر بنانے کے لئے بحروں کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے، جن کی خاص خوبی ترنم آفرینی ہے، فارسی کی لطافت ملک کے مقامی اثر نے ان نظموں کو ایک خاص انفرادیت عطا کردی ہے، بیخودی و سرشاری و روانی ان کے کلام کے خاص جوہر ہیں جو دل و دماغ کو فوراً اپنی طرف متوجہ کرلیتے ہیں۔

www.urduacademyts.com

حفیظؔ کے گیت بھی بڑے موثر ہیں، چونکہ وہ بحروں کی دل کشی کا خاص لحاظ رکھتے ہیں، اسی وجہ سے اثر زیادہ ہوتا ہے، نرم و شیریں الفاظ جو بلندی کی چاشنی لے کر موضوع کو سراپا نغمہ بنادیتے ہیں، ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملاح، شہسوارِ کربلا، نغمے ایسی نظمیں ہیں جن کو پڑھ کر حفیظؔ کی نظم نگاری کی صلاحیت کا قائل ہوجانا پڑتا ہے، سیاسی، تاریخی و مذہبی اور تخیلی کارناموں میں سیرت نگاری صداقت و شعریت کو ایک جگہ اتنا کامیاب بنادینا ہر شخص کا کام نہیں۔

☆☆☆

www.urduacademyts.com

پریت کا گیت

اپنے من میں پریت
بسالے
اپنے من میں پریت

من مندر میں پریت بسالے　　او مورکھ او بھولے بھالے
دل کی دنیا کر لے روشن　　اپنے گھر میں جوت جگالے
پریت ہے تیری ریت پُرانی　　بھول گیا او بھارت والے

بھول گیا او بھارت والے
پریت ہے تیری ریت
بسالے
اپنے من میں پریت

(۲)

اپنے من میں پریت
بسالے
اپنے من میں پریت

کرودھ کپٹ کا اُترا ڈیرا　　چھایا چاروں کھونٹ اندھیرا
شیخ برہمن دونوں رہزن　　ایک سے بڑھ کر ایک لٹیرا
ظاہر داروں کی سنگت میں　　کوئی نہیں ہے سنگی تیرا

www.urduacademyts.com

کوئی نہیں ہے سنگی ترا
من ہے تیرا میت
بسالے
اپنے من میں پریت

(۳)

اپنے من میں پریت
بسالے
اپنے من میں پریت

بھارت ماتا ہے دُکھیاری دُکھیارے ہیں سب نر ناری
تو ہی اُٹھالے سندر مرلی تو ہی بن جا، شام، مراری
تو جاگے تو دنیا جاگے جاگ اٹھیں سب پریم پجاری
جاگ اٹھیں سب پریم پجاری
گائیں تیرے گیت
بسالے
اپنے من میں پریت

(۴)

اپنے من میں پریت
بسالے
اپنے من میں پریت

www.urduacademyts.com

نفرت اک آزار ہے پیارے　　دکھ کا دارو پیار ہے پیارے
آجا اصلی روپ میں آجا　　تو ہی پریم اوتار ہے پیارے
یہ ہارا تو سب کچھ ہارا　　من کے ہارے ہار ہے پیارے

من کے ہارے ہار ہے پیارے
من کے جیتے جیت

بسالے
اپنے من میں پریت

(۵)

اپنے من میں پریت
بسالے
اپنے من میں پریت

دیکھ بڑوں کی ریت نہ جائے　　مر جائے پر میت نہ جائے
میں ڈرتا ہوں کوئی تیری　　جیتی بازی جیت نہ جائے
جو کرنا ہے جلدی کرلے　　تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے

تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے
وقت نہ جائے بیت

بسالے
اپنے من میں پریت

☆☆☆

www.urduacademyts.com

ساحرؔ لدھیانوی

عبدالحی نام، ساحرؔ تخلص۔ ۱۹۲۱ء میں لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ والد چودھری فضل احمد خوش حال اور صاحب حیثیت آدمی تھے۔ ابھی کم سن ہی تھے کہ والد اور والدہ میں کشیدگی اس حد تک بڑھی کہ علحدگی ہوگئی۔ ساحرؔ ماں کے ساتھ رہنے لگے۔ ان کی تعلیم و تربیت والدہ اور ماموں کی زیرنگرانی ہوئی۔ دیال سنگھ کالج سے بی اے کیا۔ کم عمری سے شاعری شروع کی۔ ۱۹۴۷ء تک ایک خاص شہرت کے مالک ہوگئے۔ ساحرؔ نے اپنی ملازمت کا سلسلہ بھی ادبی مشاغل میں ڈھونڈھا۔ چنانچہ لاہور میں ادب لطیف اور سویرا ماہ ناموں میں بحیثیت مدیر کام کرتے رہے۔ دلی میں ''شاہراہ'' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ تقسیم ہند میں بڑے مصائب برداشت کرنے پڑے۔ حالات نے انھیں بمبئی پہنچادیا۔ اپنی شاعرانہ صلاحیتوں سے فلمی گیت لکھنے میں مصروف ہوئے جو بے حد مقبول ہوئے۔

نثر میں کارل مارکس اور سامراج دو ترجمے اور نظم میں ''تلخیاں'' اور ''پرچھائیاں'' مجموعے شائع ہوئے جو بے حد مقبول اور مشہور ہیں۔

ساحرؔ کی شاعری اپنے عہد کا مرقع ہے۔ سیاسی، سماجی حالات کی عکاسی ان کی نظموں میں اکثر و بیشتر پائی جاتی ہے۔ غریبوں کا دکھ، درد، ماحول کی کشمکش، ملک کی ابتری اور سماج کی مفلسی ان کے محبوب موضوعات ہیں۔

انداز بیان کے لحاظ سے ساحرؔ کی نظموں میں میرؔ کا انداز مخاطب ملتا ہے۔ کبھی وہ اپنے آپ سے باتیں کرتے ہیں، کبھی محبوب سے اور کبھی کسی اور سے، مگر جس سے بھی مخاطب ہوتے ہیں اس کے شایان شان الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ ساحرؔ کا انتقال اُردو شاعری میں ایک اچھے شاعر کا نقصان ہے۔

☆☆☆

www.urduacademyts.com

اے شریف انسانو!

(ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کے پس منظر میں لکھی گئی اور معاہدہ تاشقند کی سالگرہ پر نشر کی گئی)

خون اپنا ہو، یا پرایا ہو — نسلِ آدم کا خون ہے آخر
جنگ، مشرق میں ہو، کہ مغرب میں — امنِ عالم کا خون ہے آخر
بم گھروں پر گریں کہ سرحد پر — روحِ تعمیر، زخم کھاتی ہے
کھیت اپنے جلیں، کہ غیروں کے — زیست فاقوں سے تلملاتی ہے
ٹینک آگے بڑھیں کہ پیچھے ہٹیں — کوکھ دھرتی کی بانجھ ہوتی ہے
فتح کا جشن ہو، کہ ہار کا سوگ — زندگی میتّوں پہ روتی ہے
جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے — جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی؟
آگ اور خون آج بخشے گی — بھوک اور احتیاج کل دے گی
اس لیے اے شریف انسانو! — جنگ ٹلتی رہے، تو بہتر ہے
آپ اور ہم سبھی کے آنگن میں — آپ اور ہم رہیں تو بہتر ہے

برتری کے ثبوت کی خاطر — خوں بہانا ہی کیا ضروری ہے
گھر کی تاریکیاں مٹانے کو — گھر جلانا ہی کیا ضروری ہے؟
جنگ کے اور بھی تو میداں ہیں — صرف میدانِ کشت و خوں ہی نہیں
حاصلِ زندگی خرد بھی ہے — حاصلِ زندگی جنوں ہی نہیں
آؤ! اس تیرہ بخت دنیا میں — فکر کی روشنی کو عام کریں

www.urduacademyts.com

امن کو جن سے تقویت پہنچے ایسی جنگوں کا اہتمام کریں
جنگ، وحشت سے، بربریت سے امن، تہذیب و ارتقا کے لیے
جنگ مرگ آفریں سیاست سے امن، انسان کی بقا کے لیے
جنگ، افلاس اور غلامی سے امن، بہتر نظام کی خاطر
جنگ، بھٹکی ہوئی قیادت سے امن، بے بس عوام کی خاطر
جنگ، سرمایے کے تسلط سے امن، جمہور کی خوشی کے لیے
جنگ، جنگوں کے فلسفے کے خلاف امن، پُرامن زندگی کے لیے

☆☆☆

www.urduacademyts.com

شاؔذ تمکنت

شاذ تمکنت ۳۱؍جنوری ۱۹۳۳ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد ۱۹۴۱ء میں نامپلی اسکول میں داخلہ لیا۔ انہیں ابتدا ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ ۱۹۴۹ء میں پہلی نظم والدہ کی یاد میں کہی۔ اس کے بعد حیدرآباد اور ہندوستان کے کئی رسالوں میں کلام کی باقاعدہ اشاعت ہونے لگی۔ ان کے کلام کے مجموعے 'تراشیدہ' اور 'نیم خواب' قابلِ ذکر ہیں۔ مخدوم محی الدین کی حیات اور ادبی کارناموں پر مقالہ لکھ کر انہوں نے ۱۹۸۳ء میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر اور نثر نگار تھے۔ شاذ کی کتابوں پر مختلف اداروں اور انجمنوں نے گراں قدر ایوارڈ عطا کیے۔ ۱۸ ؍اگست ۱۹۸۴ء کو شاؔذ کا انتقال ہوا۔

شاؔذ بھی ان شاعروں میں سے ہیں جو نظم و غزل گوئی پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ تراشیدہ ان کے مجموعۂ کلام کا نام ہی نہیں بلکہ خود ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت اور وصف ہے۔ ان کے کلام میں اندازِ بیان کی تراش خراش ملتی ہے۔ وہ اپنے کلام کو ہر ممکن طریقے سے خوب صورت اور متناسب بناتے ہیں اور الفاظ کو نکھارتے اور سنوارتے ہیں۔ وہ سرزمینِ دکن کے مایہ ناز شاعروں میں سے ہیں۔

☆☆☆

www.urduacademyts.com

اب کے برس

کوئی دستک کوئی آواز کوئی نغمۂ نو
درِ گل باز کر، اے بادِ صبا اب کے برس
چاند کو گھول دے پیمانۂ شب میں اب کے
رنگ میں ڈوب دے سورج کی ضیا اب کے برس
شمع کا نور ہو پگھلے ہوئے کندن کی طرح
خاکِ پروانہ کو اکسیر بنا اب کے برس
ہر مہینہ پہ ہو پھولوں کے مہینہ کا گماں
ہر دن آتی رہے ساون کی گھٹا اب کے برس
سرو و وشمشاد و صنوبر کو ملے لطف خرام
شبنمِ خفتہ کو دے اذنِ بقا اب کے برس
جانب دل سے چلے ذکرِ رہ و رسمِ جنوں
سمتِ خوباں سے بندھے عہدِ وفا اب کے برس
نیم رس رہنے نہ پائے مرے صہبا ساقی
تلخیٔ کام و دہن اور سوا اب کے برس
من کے گوکل میں کوئی ناز کا گھنگھرو بولے
تن کے مدھوبن میں کوئی لو کا لگا اب کے برس
کھول دے بابِ اثر رول دے کچھ لعل و گہر
ابر کی طرح اُٹھے دستِ دعا اب کے برس

☆☆☆

www.urduacademyts.com

www.urduacademyts.com

مظہر علی خاں ولاؔ

ان کا اصل نام مرزا لطف علی تھا مگر مظہر علی خاں کے نام سے مشہور ہوئے، ان کے والد کا نام سلیمان علی خاں تھا اور وداؔد تخلص، فارسی کے اچھے شاعر تھے، وطن دلی تھا، مظہر علی خاں ولاؔ فارسی، سنسکرت، ہندی کے عالم تھے، مرزا جان طپشؔ اور مصحفیؔ کے شاگرد تھے، خوش قسمتی سے ان کو بھی فورٹ ولیم کالج میں جگہ مل گئی، یہاں رہ کر انہوں نے بھی بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا، مثلاً :

۱) مادھونل اور کام کنڈلا، موتی رام کبیشر کی ہندی کتاب کا ترجمہ جو ۱۸۰۲ء میں ختم ہوا۔

۲) ہفت گلشن۔ ناصر علی خاں کی فارسی کتاب کا ترجمہ ۱۸۰۲ء میں ختم کیا۔

۳) بیتال پچیسی، بیتال نامے ایک شخص کی ۲۵ کہانیاں سنسکرت میں لکھی گئی تھیں پھر کسی نے برج بھاشا میں اس کو منتقل کیا، ولاؔ نے برج بھاشا سے اُردو میں ترجمہ کیا۔

۴) تاریخ شیر شاہی، ولاؔ نے فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا، ترجمہ ۱۸۰۵ء میں ختم ہوا۔

۵) جہانگیر نامہ۔ تزک جہانگیری کے ایک حصہ کا ترجمہ ہے۔ ولاؔ کا ایک دیوان بھی اُردو میں ہے مگر نایاب ہے۔ شاملِ نصاب حکایتیں ''ہفت گلشن'' سے لی گئی ہیں۔

☆☆☆

www.urduacademyts.com

حکایات

شکم اور اعضائے بدن کا مباحثہ

تیرے لیے کرتے ہیں اور تیرے واسطے یہ سب دکھ بھرتے ہیں۔ ہمیں اس سے کیا فائدہ اور تجھ سے کیا نفع؟'' آخر کو سب نے یہ ٹھہرایا۔

ہاتھ نے کہا کہ ''آج نوالہ نہ اٹھاؤں گا۔ دیکھوں تو کیونکر کھاتا ہے؟''

دہن نے کہا کہ '' میں ہرگز لقمہ حلق کے نیچے نہ اتاروں گا۔ دیکھوں کس طرح سے تو بھرتا ہے؟''

دانتوں نے کہا ''ہم روٹی نہ چبائیں گے۔ دیکھیں تو کس طور ہضم کرتا ہے؟''

غرض سب نے اسی عہد پر عمل کیا اور غذا کے پہنچانے میں مدد نہ کی۔

تب بیچارے شکم نے صبر و شکیبائی اختیار کی۔

جب یوں ہی دو تین روز گزرے تو سب اعضا سست ہوگئے۔ کسی میں کچھ سکت نہ رہی اور خشکی بدن کے پوست پر ظاہر ہوئی۔

فائدہ قصے کا یہ ہے کہ سب نوکروں کے تئیں لازم ہے کہ اپنے ولی نعمت کی ذلت کے روادار نہ ہوں اور اپنے سردار کے تئیں نظر دشمنی سے نہ دیکھیں کہ خرابی اس کی خرابی ان کی ہے۔

خر اور دہقان

کہتے ہیں ایک گدھے نے ایک روز شیر کی کھال پہنی اور اپنا نام شیر رکھا۔

غرض اسی وضع سے ہر روز جنگل میں گزرا ایک روز ایک گنوار کا اس جنگل سے گذر ہوا اور اس کے پاس آیا۔

گدھا جس طور وحشیوں کو ڈراتا تھا اسی طرح اس گنوار کو بھی ڈرانے لگا۔

www.urduacademyts.com

دہقان نے کہا ''اے خر! تو شیر کی کھال پہن کے بیچارے وحشیوں کو ڈراتا ہے۔ لیکن میں دونوں کانوں سے اور تیرے ہاتھ پاؤں سے تجھ کو پہچان چکا ہوں۔ کیوں تو مجھ کو بازی وفریب دیتا ہے؟''

اتنا کہا اور غصے ہوکر ایک لٹھ اس کے سر پر پھرا کر مارا کہ سر اس کا پھٹ کر بھیجا نکل پڑا اور بے ہوش ہوکر زمین میں گرا۔

فائدہ قصہ کا یہ ہے کہ جو حوصلہ ہووے اتنا ہی کام کرے اور اپنی حد سے زیادہ نہ بڑھے!

☆

دو یار

سنتے ہیں دو یار تھے کہ آپس میں کمال دوستی رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ ''ایک دل ہونا خوب ہے کہ اگر کوئی دشمن سر پر ہمارے آوے تو ہاتھ اس کا نہ پڑے''۔

ایک دن شہر کے باہر کچھ کام کرتے تھے کہ قضا کار ایک ریچھ جنگل میں نمودار ہوا۔ ان دونوں میں سے جو چست و چالاک تھا درخت پر چڑھ گیا اور دوسرا بیچارہ جان کے ڈر سے مانند مردے کے زمین کے اوپر لیٹ گیا اور دم چرایا۔ اس واسطے کہ ریچھ مردے کو ایذا نہیں دیتا۔ آخر اس نے نزدیک اس کے پہنچ کر سونگھا جب کہ کچھ حس وحرکت اس میں نہ دیکھی جانا کہ مردہ ہے۔ پھر اور راہ جنگل کی لی۔

اس دم یار اس کا درخت سے اتر کر آیا اور کہنے لگا ''اے یار! ریچھ تیرے کان میں کیا کہتا تھا؟''

اس نے کہا ''مجھ سے یہ کہتا تھا کہ ایسے بے وفا یار سے دوستی نہ کیجئے''۔

فائدہ قصے کا یہ ہے جو کوئی اپنے قول قرار پر ثابت نہ رہے ساتھ اس کے دوستی رکھنی نہایت نادانی ہے۔

☆

www.urduacademyts.com

لقمان حکیم اور اس کا ایک دوست

کہتے ہیں کہ ایک روز لقمان حکیم اپنے گھر میں لڑکوں کے ساتھ کھیلتا تھا اور اپنا تردد اور تفکر بھلاتا تھا۔ اتفاقاً ایک دوست اس کا اس وقت آ گیا اور اس کو لڑکوں کے ساتھ بازی میں مشغول پایا۔

کہنے لگا ''اے یار! باوجود اس کے کہ فراست میں تو شہرہ آفاق ہے پھر کس واسطے اپنے تئیں احمقوں میں ملایا ہے اور کس سبب سے عقل وفہم اپنے کھوئے ہیں؟''

اس نے کہا ''کس طرح سے؟''

اتفاقاً ایک کمان اس وقت لقمان حکیم کے پاس تھی۔ چِلّا س کمان کا گوشے سے اتار کر اس کے آگے رکھ دی۔ وہ حیران ہوا کہ یہ کیا اسرار ہے، اور بولا ''اے لقمان حکیم! یہ نکتہ عجیب مجھ پر نہ کھلا اور اشارہ موہوم تیرا میرے قیاس میں نہیں آتا کہ تو نے کمان کیوں اتاری ہے''۔

کہا اس نے ''اگر کمان سدا چڑھی رہے تو سست ہو جائے۔''

حاصل قصہ کا یہ ہے کہ سب لوگوں کو واجب ہے کہ ہر ہفتے میں ایک روز اپنے دل کے تئیں راحت دیویں۔ سیر و شکار اور لہو ولعب سے خوش کریں تا جو مشکل کہ ان کے پیش آوے اس کے حل کرنے میں سستی اور کاہلی نہ کریں!

☆

چوہا اور میوہ فروش

کہتے ہیں کہ ایک چوہا برسوں سے کسی ایک میوہ فروش کی دوکان میں رہتا تھا اور خشک و تر میووں سے زندگی بسر کرتا تھا۔ دکان دار اس کی حرکات دیکھتا۔ ٹال دیتا اور اس کا

www.urduacademyts.com

بدلہ نہ لیتا۔

ایک روز بہ سبب ہوس کے معدہ سفلہ دوں کا جو سیر ہوا، ہزاروں شور و شر پروہ دلیر ہوا۔

آخر بہ سبب حرص کے ہیمانی اس دوکان دار کی کتر کر جتنے روپے اشرفی اس میں تھے اپنے بل میں لے گیا۔

دکاندار نے احتیاط کے وقت جو کیسہ ٹٹولا تو مفلسوں کی تھیلی کی طرح خالی پایا۔ معلوم کیا کہ یہ کام چوہے کا ہے۔ تب نا چار ہوکر اس کی جستجو کرنے لگا۔

اتفاقاً ایک روز اسے بلی نے پکڑا۔ اس نے اس کے منہ سے چھڑا ایک ڈور اس کے پاؤں میں باندھ کر چھوڑا۔ وہ بل میں گیا۔ اس نے ڈورے کو یہاں تک ڈھیلا کیا کہ وہ بل کی انتہا کو پہنچا اور ٹھہر گیا۔ تب اس نے سوراخ کو کھودنا شروع کیا۔

جب کھود چکا تو دیکھتا کیا ہے کہ مانند صرافوں کی دکان کے اشرفیاں روپیہ اس میں پھیلے ہوئے پڑے ہیں۔ ان کو جمع کر اپنے تصرف میں لایا اور چوہے کی تئیں نکال بلی کے حوالے کیا۔ اس نے اپنے کئے کا ثمرہ پایا۔

حاصل قصے کا یہ ہے کہ کبھی تو حرص وطمع کی طرف خیال نہ کر بلکہ قناعت اختیار کر کہ قانع ہونا موجب امن کا ہے!

☆

www.urduacademyts.com

امتیاز علی تاجؔ

امتیاز علی تاج کا خاندان اصل میں سہارنپور کا تھا۔ ان کے والد ممتاز علی لاہور گئے اور وہاں سے تعلیم نسواں کے سلسلے میں مختلف کتابیں اور رسالہ ''تہذیب نسواں'' نکالا۔ تاج کو بچّوں کے ادب سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہوئی۔ انھوں نے دارالاشاعت کے ذریعہ اردو زبان و ادب کی غیر معمولی خدمت انجام دی۔ تاج کا مشہور ڈراما ''انارکلی'' اردو ادب میں خاصے کی چیز ہے۔ اس ڈرامے کو بجا طور پر تاج کا شاہکار کہا جاتا ہے۔ یہ حقیقی معنوں میں ایک شاندار ادبی کارنامہ ہے اور اردو ڈرامے کی تاریخ میں ایک نمایاں اور اہم سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے۔

تاج نے ''چچا چھکّن'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں چچا چھکّن کی مختلف حرکتوں اور عادتوں کو بڑے دلچسپ انداز میں لکھا گیا ہے۔ شخصیت کا دلچسپ یا مضحکہ خیز ہونا کوئی ایسی بات نہیں ،البتہ ان کو لفظوں کے ذریعہ سامنے لا کر رکھ دینا اور اس خوبی کے ساتھ کہ سنجیدہ سے سنجیدہ آدمی بھی اسے پڑھ کر ہنسنے سے باز نہ رہ سکے۔

اردو ادب میں تاج کی یہ کتابیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

☆

قدسیہ زیدی

قدسیہ زیدی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر کرنل بشیر حسین زیدی کی بیوی تھیں۔آپ نے زندگی کا اہم حصہ نئی دہلی میں گزارا۔ان کے ادبی زندگی کی ابتدا بچوں کی کتابوں سے ہوئی جس میں گاندھی بابا کی کہانی بہت مقبول ہوئی۔ اس کا پیش لفظ پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا تھا۔اس پر حکومت ہند نے انھیں انعام بھی دیا تھا۔انھوں نے بچوں کے لئے

www.urduacademyts.com

متعدد ڈرامے لکھے لیکن جلد ہی بچوں کے ادب کے ساتھ انھیں ڈراما نگاری کا شوق ہوا اور یہ شوق اس حد تک بڑھ گیا کہ آپ نے چند احباب کی مدد سے دلّی میں ''ہندوستانی تھیٹرز'' کی بنیاد رکھی اور تن من دھن سے اس کام میں لگ گئیں۔ اس تھیٹر کے ذریعہ بیگم زیدی نے متعدد ڈرامے پیش کئے جو دہلی کے علاوہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں دکھائے گئے۔ انھیں عوام نے بے حد پسند کیا اور ان ڈراموں نے پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی خراج تحسین حاصل کیا۔

بیگم زیدی کے زیادہ تر ڈرامے مشرق ومغرب کے اہم ڈراموں سے ماخوذ ہیں۔انہوں نے ان ڈراموں میں ہندوستانی ماحول کو اس خوبی سے منتقل کیا کہ ان پر اصل کا شبہ ہوتا ہے۔ان کی زبان سادہ اور چست ہوتے ہیں۔بیگم زیدی کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ جب وہ کسی ڈرامے کو اردو میں اپنانے کا خیال کرتیں تو چند روز میں اپنے اندر ایک ایسی کیفیت پیدا کرلیتیں کہ گویا وہ اسی ماحول میں سانس لے رہی ہیں۔ اس ڈرامے سے متعلق تمام چیزیں پڑھ رہی ہیں۔ وہ جس لگن سے اپنے ادبی کام کرتی تھیں، وہ قابلِ رشک تھا۔

بیگم زیدی نے سنسکرت کے شاہکار ''شکنتلا'' کا اردو اور ہندی میں ترجمہ کیا۔اس کے لئے انھوں نے سنسکرت زبان سیکھی اور مہینوں کی ریاضیت کے بعد مکمل کیا۔ یوں تو شکنتلا کے ترجمے پہلے بھی ہو چکے ہیں لیکن بیگم زیدی کا ترجمہ منفرد تھا۔

ابھی اردو ادب میں ان کے کاموں کا پورے طور پر جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ ان کی بہت سی کتابیں ابھی شایع نہیں ہوئی ہیں لیکن جب یہ کام ہوگا تو ہمیں معلوم ہوگا کہ انھوں نے اتنے تھوڑے عرصہ میں کتنا کام کیا ہے۔

بیگم زیدی نے امتیاز علی تاج کی مشہور کتاب ''چچا چھکّن کے چار روپوں کو ڈرامے کی شکل دی۔ ''تلاش'' اس کا ایک روپ ہے۔ یہ چاروں ڈرامے اکثر اسکولوں میں اسٹیج بھی کئے جاتے ہیں۔

www.urduacademyts.com

تلاش

کردار : چچا ، چچی ، ودّو، چھٹّن ،بنّو ، اماں جی ، بندو، خانصاحب

ملازم :

[دالان میں ایک چارپائی ،ایک تخت جس پر میلے کپڑے رکھے ہیں،دو کرسیاں، ایک دو چھوٹی میزیں،صراحی وغیرہ ہیں۔فرش پر کاغذ، چھپٹیاں اور رسّی کے ٹکڑے پڑے ہیں۔ پچھلی دیوار میں ایک دروازہ ہے جو غسل خانہ میں کھلتا ہے۔ دائیں ہاتھ کا دروازہ باورچی خانے کو،بائیں کا باہر جاتا ہے۔سامنے دیوار پر ایک ربڑ کی تھیلی ٹنگی ہے۔

چلّے کا جاڑا ہے۔صبح کے تین بجے ہیں۔چچا سر سے پاؤں تک لحاف اوڑھے سو رہے ہیں۔ کمرہ ان کے خراٹوں سے گونج رہا ہے۔ بائیں ہاتھ کا دروازہ کوئی دھڑ دھڑ پیٹ رہا ہے۔جواب نہ ملنے پر پھر پیٹتا ہے۔]

چچا : (لحاف میں سے ہاتھ نکال کر لیمپ جلاتے ہیں۔ پھر نہایت احتیاط سے منھ لحاف میں سے نکالتے ہیں۔گھڑی میں وقت دیکھ کر) لاحول ولاقوۃ! کون ہو جی؟

(زور دار دستک) دم بھی لوگے یا پیٹے ہی جاؤ گے کواڑ؟ (لحاف میں سے نکلتے ہیں۔ کنٹوپ پہنتے ہیں، رضائی اوڑھتے ہیں اور سو سو کرتے ہوئے بائیں ہاتھ کے دروازے کی طرف جاتے ہیں) یہ بھی کوئی وقت ہے بھلے آدمیوں کو جگانے کا؟ (دروازہ کھول کر) ابے پاجی تو اس وقت کیا کر رہا ہے یہاں؟

ملازم : خانصاحب کے پیٹ میں بہت درد ہے۔ انھوں نے تمہاری ربڑ کی تھیلی منگوائی ہے۔

www.urduacademyts.com

چچا : بس کھا گئے ہوں گے رات دعوت میں اناپ شناپ۔آخر کھانا کسی اور کا تھا تو پیٹ تو خانصاحب کا اپنا تھا۔ (جمائی لے کر) کوئی یہ پوچھے کہ بھلا اناڑی کی سی توپ بھرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آخر پٹھان جو ٹھہرے اور پھر یہ کہ صبح تین بجے پیٹ میں درد کر لیا۔

ملازم : خانصاحب کے پیٹ میں تو دو بجے سے درد ہے۔

چچا : لیجئے ذرا غور تو فرمایئے ۔شریف آدمی کچھ تو وقت کا لحاظ رکھا ہوتا۔ بے وقت کی راگنی اسی کو تو کہتے ہیں۔

ملازم : اجی کوئی یہ بھی اپنے بس کی بات ہے؟

چچا : تو پھر کیا ہمارے بس کی بات ہے ۔خیراتی ہسپتال میں داخل کیوں نہ ہو گئے' یہ تو گھر ہے' کوئی شفا خانہ تو ہے نہیں کہ جس وقت جس کا جی چاہا سوتوں کو بے آرام کیا اور ربڑ کی تھیلی طلب کر لی۔

ملازم : تو پھر۔۔۔

چچا : تو پھر کیا۔اب آیا ہے تو لیتا ہی جا تھیلی ۔رک۔ ہم ابھی لائے دیتے ہیں(دیوار پر سے تھیلی اتار کر دیتے ہیں اور دروازہ بند کر لیتے ہیں) نا معقول انسان (کنٹوپ اور رضائی اتار کر رکھ دیتے ہیں اور لحاف میں گھس جاتے ہیں۔ لیمپ بڑھا کر منھ لحاف سے ڈھانپ لیتے ہیں۔کروٹ لے کر سونے کی کوشش کرتے ہیں کہ ایک بار پھر کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ لحاف میں سے منھ نکال کر) اب یہ کہلوایا ہوگا کہ انتقال فرما گئے ہیں۔ آکر تجہیز و تکفین کا انتظام کردو۔ مردود !(لیمپ جلاتے ہیں۔ جا کر دروازہ کھولتے ہیں تو خانصاحب کا نوکر تھیلی لئے کھڑا ہے۔)

ملازم : خانصاحب نے کہا کہ اسے اپنے پاس انڈے دینے دیجیے ۔ہم بوتل سے کام چلالیں گے اور اب کبھی ہم سے پالش کی شیشی منگا کر دیکھئے گا۔

www.urduacademyts.com

چچا : (تھیلی ہاتھ میں لئے دم بخود کھڑے ہیں) ارے کمبخت صبح صبح پرائیویٹ بات جا کر خان صاحب سے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو ہم نے۔۔۔

ملازم : اور خانصاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ جب بیمار ہوں تو خیراتی ہسپتال میں چلے جایئے گا۔

چچا : ذرا ملاحظہ تو فرمایئے شرافت خانصاحب کی، بھلا نوکر کے ہاتھ اخلاق سے ایسی گری ہوئی بات کہلوا بھیجنا کہاں کی انسانیت ہے(دروازہ بند کر لیتے ہیں۔ربڑ کی تھیلی تخت پر پٹک دیتے ہیں اور آ کر پھر لیٹ جاتے ہیں) جیسے ان کے باپ کی میراث مجھے ربڑ کی تھیلی ملی تھی۔۔۔ ہونہہ، اور مزاج تو دیکھو پٹھان کا کہ اپنے ہی پاس انڈے دینے دیجئے مرغی کے۔۔۔ دھمکی دیتا ہے کہ پالش منگا کر دیکھئے(اٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں) جیسے شہر بھر میں یہی تو ایک موچی رہ گیا ہے(لیٹ کر لیمپ بڑھا دیتے ہیں' سونے کی کوشش کرتے ہیں)۔ (لحاف میں سے منہ نکال کر) کمبخت اجالا ہی نہیں ہو چکتا کہ امامی چلم ہی بھر لاتا۔(بیٹھ جاتے ہیں)'سارا گھر پڑا سو رہا ہے جیسے کمبخوں کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ (کھڑے ہو جاتے ہیں) افلاطون۔ اور آخر اس میں جھوٹ بھی کیا ہے کہ گھر ہے کوئی خیراتی ہسپتال تو ہے نہیں کہ جس وقت جس کا جی چاہا سوتوں کو بے آرام کیا اورر بڑ کی تھیلی طلب کر لی) آخر کوئی چندے کی تھیلی ہے اور پھر یہ مزاج کہ اپنے ہی پاس انڈے دینے دیجئے۔ (دائیں ہاتھ کے دروازے سے باورچی خانے میں جاتے ہیں' وہیں سے) گھر داری کرنے چلی ہیں۔ (اندر آتے ہیں) اتنی توفیق نہیں کہ سونے سے پہلے بھوبھل میں لکڑی دبا دیں (چارپائی کے پاس آتے ہوئے) اور ہر وقت کی ضد کہ یہ کرتی ہوں میں وہ کرتی ہوں۔ میں کام سے مری جاتی ہوں۔ (غصہ میں آ کر) حالت یہ ہے کہ گھر میں پالش تک منگا کر رکھنے کا ہوش نہیں۔ ضرورت ہوتو ہمسایوں کے ہاں سے پالش منگایا جاتا ہے۔ (چارپائی پر بیٹھ کر) اور اس کم ظرف کو دیکھو کہ پالش کیا

www.urduacademyts.com

دے دی حاتم کی گور پرلات ماردی۔ جو برابر پالش لے لی تو بدلے میں ربڑ کی تھیلی انھیں بخش دو کمینہ کہیں کا۔ (اٹھ کر کھڑے ہوجاتے ہیں) اور بیوی صاحبہ کو دیکھئے کہ جنھیں اتنا خیال نہیں کہ چلم کے لئے تھوڑی سی آگ کا انتظام کردیں (بڑبڑاتے ہوئے کاغذ' جھپٹیاں' رسی وغیرہ جمع کرتے ہیں۔ پھر باورچی خانے میں جاکر لوہے کی انگیٹھی لاتے ہیں۔ میز پر سے ماچس لے کر انگیٹھی میں آگ جلاتے ہیں۔) لیجئے اب تمباکو تلاش کیجئے (پھر باورچی خانے میں جاکر لپٹن چائے کا گندا ساٹین زمین پر پٹخ دیتے ہیں) کمبخت خالی پڑا ہے۔ تمباکو ہاتھ دھولے (امامی بیچ کے دروازے سے غسل خانے میں جاتا ہے۔ چچی بستر وغیرہ ٹھیک کرتی ہیں۔ پھر دائیں سے باہر چلی جاتی ہیں)

چچی : (باہر سے) منھ دھوچکا ہوتو ادھر باورچی خانے میں آجا۔

امامی : ابھی آیا (غسل خانے میں سے منھ پونچھتا ہوا نکلتا ہے اور دائیں سے باہر چلا جاتا ہے)

چچا : (بائیں سے اندر آتے ہیں چہرہ تمتمایا ہوا ہے بڑبڑا رہے ہیں) ربڑ کی تھیلی بخش دو باپ کی میراث' موچی کہیں کا۔

امامی : (کشتی میں چائے لے کر آتا ہے)۔ بیوی نے چائے بھجوائی ہے۔

چچا : لے جا واپس اور کہہ دے کہ اسے بھی اٹھا کر طاق میں رکھ دیں۔

(امامی چائے لے کر چلا جاتا ہے) نوکروں کے سامنے کیا ہمسایوں کے سامنے تک مجھے رسوا کر ڈالا۔ ورنہ اس پٹھان کی طاقت تھی کہ پالش کا طعنہ دے جاتا۔ آخر کوئی حد بھی ہو۔ بس اب ہوچکی ۔۔۔ اب نہیں ادھر کی دنیا ادھر ہوجائے ۔۔۔ مگر انکار ۔۔۔ جب دیکھو نوکروں کی طرف داری ۔۔۔۔ زندگی اجیرن کرڈالی ۔۔۔ آیا تھا بڑا طاق ۔۔۔ طاق کا بچہ ۔۔۔۔ طاق میں پالش کی شیشی منگا کر نہ رکھی گئی۔ شیشی ہوتی تو میں کیوں منگاتا اس چمار سے پالش میری عقل ماری گئی تھی ۔۔۔ جو برابر پالش لے کر ربڑ

www.urduacademyts.com

کی تھیلی انھیں دے ڈالو۔ بڑے آئے کہیں کے۔

(دائیں ہاتھ کے دروازے کے پاس کھڑے ہوکر اندر جھانکتے ہیں' پھر واپس لوٹتے ہیں۔ ہم نہیں پئیں گے چائے' امامی کو پلادیں (بائیں ہاتھ کے دروازے سے باہر چلے جاتے ہیں)

(ددّو اور چھٹّن اندر آتے ہیں۔ ددّو تولیہ ہاتھ میں لئے ہے۔ غسل خانے میں چلا جاتا ہے۔ چھٹّن لٹّو سے کھیلتا ہے غسل خانے کا دروازہ بند ہے۔ پانی گرنے کی آواز آتی ہے۔ چھٹّن لٹّو چھوڑ کر جاتا ہے اور غسل خانے کا دروازہ پیٹتا ہے۔)

چھٹّن: جلدی نکلو ہم بھی نہائیں گے۔

ددّو : (اندر سے) نہیں نکلتے۔ نہالیں گے تو نکلیں گے۔

چھٹّن: (دروازہ پیٹ کر) نکلو گے کیسے نہیں۔

ددّو : جاؤ جا کر اماں سے کہہ دو۔

چھٹّن: نکلو۔۔۔ نکلو۔۔۔ (دروازہ پیٹتا ہے۔ پھر جا کر لٹو سے کھیلنے لگتا ہے) چچا غصے میں اندر آتے ہیں اور سیدھے غسل خانے کے دروازے کی طرف جاتے ہیں۔ دروازہ بند ہے چچا کا سر اس سے ٹکراتا ہے)

ددّو : (اندر سے) نہیں مانے گا تو چھٹّن۔ میں اماں سے جا کر کہہ دوں گا' چھٹّن مجھے نہانے نہیں دیتا۔

(چھٹّن ہنسی کے مارے بے قرار ہوجاتا ہے۔ چچا سر سہلاتے ہیں۔ پھر چھٹّن کو ہنستے ہوئے دیکھ کر اس کی طرف لپکتے ہیں۔ چچی دائیں سے اندر آتی ہیں۔ چھٹن دوڑ کر چچی سے لپٹ جاتا ہے۔ چچا بے بس ہوکر لوٹتے ہیں اور چھٹّن دائیں کو چلے جاتے ہیں۔)

(غسل خانے کا دروازہ پیٹ کر) نکل باہر۔

www.urduacademyts.com

(اندر سے)نہا تو لوں۔۔۔

نہیں ابھی نکل۔۔۔

صابن تو اتار لوں۔۔۔

کہہ جو دیا کہ ابھی نکل جیسا ہے ویسا ہی نکل۔۔۔

ابّا صابن لگا ہے۔۔۔

آتا ہے باہر یا بتاؤں میں۔ صابن ہے تو ہوا کرے۔

(ددّو صابن منھ اور جسم پر ملے دھڑ سے تولیہ لپیٹتے اندر آتا ہے) پاجی کہیں کا نکل ہی نہیں چکتا تھا۔ ابے کہا جو تھا ہم نے جیسا ہے ویسا ہی نکل آ چینچوائے چلا جاتا ہے (ایک چانٹا رسید کرتے ہیں)

(روتا ہے) صابن گھس گیا آنکھوں میں (روتا ہے)

(فوراً غسل خانے میں گھس جاتے ہیں اور اندر سے چٹخنی چڑھا لیتے ہیں۔ ددّو دروازے پر کھڑا رو رہا ہے) تو نہیں چپ ہوگا (ددّو روتا ہے)۔

دیکھ میں کہتا ہوں سرک جا یہاں سے، نہیں اچھا نہ ہوگا۔ میں دروازہ کھول کر اتنی لگاؤں گا کہ اماں ربڑ کی تھیلی سے سینک کرتی پھریں گی۔

چچی : (دائیں سے اندر آتی ہیں) کیا ہوا لال کیوں رو رہا ہے؟ آجا تو میرے پاس آجا۔

ددّو : (روکر) ابا نہانے نہیں دیتے۔ غسل خانے میں سے نکال دیا۔ دیکھو تو اماں سارے پنڈے پر صابن لگا ہے۔

چچی : حد کرتے ہیں بعض دفعہ تو بچوں کی سی باتیں کرنے لگتے ہیں اور آج صبح تو نہ جانے کیا آفت آرہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی سے لڑ کر آئے ہیں۔ چلو میں تجھے نہلا دوں۔ پھر کوئی اور کام کروں گی۔ (چچی ددّو کو لے کر دائیں کو جارہی ہیں۔ چچا غسل خانے کا

www.urduacademyts.com

دروازہ کھول کر دیکھتے ہیں پھر بند کر لیتے ہیں۔ ددّو اور چچی لوٹ کر آتے ہیں۔)

چچی : (غسل خانے کے دروازے کے باہر کھڑے ہوکر) چھٹن کے ابّا دوسرا تولیہ لادوں۔ تولیہ تو بچہ باندھ کر چلا آیا ہے۔

(پانی گرنے کی آواز)

چچی : (ددّو سے) چل تو، تو چل، نہیں لیتے تولیہ تو نہ لیں۔ (دونوں چلے جاتے ہیں)

چچا : (دروازہ کھول کر اندر آتے ہیں۔ گیلا کرتہ پاجامہ پہن رکھا ہے) ہونہہ! (بائیں دروازے سے باہر چلے جاتے ہیں۔ پھر فوراً ہی اندر آتے ہیں جیسے کچھ ڈھونڈ رہے ہوں۔ غسل خانے میں جاتے ہیں پھر اندر آتے ہیں۔) نہ جانے کہاں چلی گئی۔ (طاق میں تلاش کرتے ہیں) طاق سب چیزیں طاق ..... بدمعاش'' پالش کی شیشی منگوا کر دیکھئے گا۔'' بس یہی تو خرید سکتا ہے پالش اور تو سب قلانچ ہیں۔ ایک دم سے چھ شیشیاں خرید کے لاؤں گا اور سب کو طاق ..... پاجی حرام خور تمبا کو اٹھا کر طاق میں رکھ گیا مگر..... اس پٹھان کے ہاتھوں ذلیل کرادیا۔ (اکڑوں بیٹھ کر نعمت خانے کے نیچے دیکھتے ہیں) لاحول ولاقوۃ۔ گئی تو کہاں گئی (تکیے کے نیچے دیکھتے ہیں) آخر پر تو نہیں لگ گئے اسے (تخت پر رکھے ہوئے کپڑوں کو ٹٹول کے دیکھتے ہیں) یہاں بھی نہیں (چاروں طرف گھوم کر) اس گھر میں ہر چیز غائب ہوجاتی ہے۔ پھوہڑ پن کی حد ہوگئی۔ بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ اگر پالش کی شیشی منگوا کر رکھ لیتیں تو کیا حرج تھا (پھر تلاش میں لگ جاتے ہیں) تخت پر کے میلے کپڑے اٹھا کر ایک ایک کر کے جھاڑتے ہیں) کم بخت سوئی بھی ہوتو الگ ہوکر گر پڑتی۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ (لوٹوں کے نیچے دیکھتے ہیں) سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں ہوسکتی ہے (داڑھی کھجاتے ہیں) اچھا صبح سے شروع کروں۔ ..... صبح ..... خانصاحب ..... اپنے پاس انڈے دینے دیجئے۔ بدمعاش!

www.urduacademyts.com

رات کے تین بجے پیٹ میں درد کرلیا۔ تکلیف دہ انسان اور یہ نہیں کہ صبح تک انتظار کرلیں، نہیں لاٹ صاحب کے بچے رات کے تین بجے جگوائیں گے شریف آدمیوں کو۔ اور اسے دیکھو کہ صبح صبح جا کر پرائیوٹ بات خانصاحب سے کہہ دی۔ کمینہ، کم ظرف۔ بھلا یہ بات ان سے کہنے کی تھی (پھر بستہ ٹٹولتے ہیں) یعنی حد ہوگئی۔ ارے او(رک جاتے ہیں) بندۂ نامعقول۔ گدھا۔ خوب یاد آیا۔ صبح باورچی خانہ میں گیا تھا انگیٹھی لینے۔ شاید وہیں رکھ دی ہوگی۔ (باورچی خانہ میں جھانکتے ہیں) دیکھی بیگم صاحبہ کی حرکت، ایسی چپ چپ اور انجان سی بنی بیٹھی ہیں گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ ہونہہ! اس طرف نظر ہی نہیں اٹھاتیں۔ چہرے پر کیا پارسائی اور شہد پن برس رہا ہے۔ (چٹکی بجا کر) اب آیا سمجھ میں۔ بھٹیارہ ہے نمازی تو ضرور ہے۔ دغا بازی۔ انہوں نے ہی چھپا رکھی ہے۔ تبھی تو بے نیازی کا یہ عالم ہے۔...... خیال ہوگا کہ آخر ہار جھک مار کر مانگنے آئے گا۔ (پھر جھانکتے ہیں) اب اس طرف دیکھانا۔ میں پہلے ہی جانتا تھا کہ چپکے چپکے میری پریشانیوں کا تماشا دیکھ رہی ہیں۔ اس بچپن کی بھلا کوئی حد بھی ہے۔ میں نے بھی بیگم صاحبہ کا پاندان ہی غائب نہ کیا ہوتو کہنا۔ (مووا اندر آتا ہے) کیوں بے مووے! بیوی کیا کررہی ہیں؟

مووا : ہنڈیا بگھار رہی ہیں۔ (چلا جاتا ہے۔ بائیں ہاتھ کے دروازے سے)

چچا : (ٹہلتے ہیں) کیا بیہودہ مذاق ہے۔ اوراگر میں ان کی اوڑھنی کو دیا سلائی دکھا دوں جب؟

بنو : (بنو اندر آتی ہے۔ ہنڈکلیا کا سامان لئے ہوئے ہے) ابا میاں گڑ کے چاول کھاؤ گے؟

چچا : ادھر تو آ بنو۔ ایک کام کیجیو۔ ہماری عینک کھوگئی ہے۔ باورچی خانے میں رکھی تھی۔ ڈھونڈ کر لا دے۔

بنو : کون سی عینک؟

www.urduacademyts.com

چچا : احمق کہیں کی۔ جو عینک ہم لگاتے ہیں اور کون سی ، مگر دیکھ تیری اماں کو نہ معلوم ہونے پائے۔

بنو : (مسکرا کر) اپنی عینک لگا تو رکھی ہے آپ نے۔

چچا : (چونک کر ہاتھ آنکھوں کی طرف بڑھاتے ہیں) ہیں! (اتارتے ہیں۔ ہاتھ میں لے کر گھماتے ہیں۔ سوچتے ہیں۔ پھر بنو کی طرف دیکھ کر) یہ یہیں تھی۔ کب لگائی تھی ہم نے؟

بنو : (زور سے قہقہہ لگاتی ہے) اماں! اماں! ہم تو اماں کو سنائیں گے۔ (بھاگنے لگتی ہے)۔

چچا : (لپک کر اسے پکڑ لیتے ہیں) ہیں ہیں! کیا ہوا؟ کہاں چلی؟ گلاب جامن کھائے گی ، اری وہ بات تو ہم نے مذاق میں کہی تھی، پاگل کہیں کی۔ اس میں اماں کو سنانے کی کیا بات ہے۔ دیوانی ہوئی ہے۔ کیا لائیں تیرے لئے بازار سے؟

بنو : (بھاگنے کی کوشش کرتی ہے) اماں ! اماں!!

چچا : تھپڑ ماروں گا میں۔

بنو : اماں! اماں!!

چچا : بدتمیز (بنو کو دھکا دے دیتے ہیں۔ وہ گر کر رونے لگتی ہے۔ چچا جلدی سے بائیں ہاتھ کے دروازے سے باہر چلے جاتے ہیں)

چچی : (باورچی خانے سے) بنو۔ او بنو۔ کیوں ریں ریں کر رہی ہے۔ کیا ہوا؟ (چچی دائیں سے آتی ہیں۔ بنو کو اٹھا کر پیار کرتی ہیں) کیوں رو رہی ہے۔ صبح صبح کس نے مارا؟

بنو : ابا.....(روکر)ابا.....

چچی : کوئی شرارت کی ہوگی؟

www.urduacademyts.com

بنو : (ناک پونچھتے ہوئے) نہیں ابا کی عینک .....

چچا : (بائیں سے اندر آتے ہیں۔ بڑی سی ٹوکری مٹھائی کی ہاتھ میں لئے ہیں) ابے اوچھٹن، اوللو، چلو۔ آؤ ہم تمہارے لئے مٹھائی لائے ہیں۔ لے بنو بیٹا تو بھی لے۔ (سب کو مٹھائی تقسیم کرتے ہیں۔ چچی باورچی خانے میں چلی جاتی ہیں) لے ددّو تو ایک اور حصہ لے اور بنوتو بھی لے۔ (کاغذ پر مٹھائی رکھ کر) لے بندو یہ بیوی کو دے آ (بندو مٹھائی کو لے کر دائیں کو جاتا ہے۔ سب بچے مٹھائی کھاتے ہیں)۔

چچا : (فٹ لائٹ کے قریب آ کر) او امامی ذرا ادھر تو آیار۔ یہ لوتم ایک آنہ اور اگر کام کروتو چونی انعام۔ دیکھ خانصاحب نکڑ کی دوکان پر حجام کے ہاں بیٹھے خط بنوا رہے ہیں۔ بائیسکل ان کا دوکان کے باہر رکھا ہے۔ تو چپکے سے جا کر ان کے بائیسکل میں پنکچر کر دیجیو۔ بڑے آئے پالش کی شیشی والے۔

☆☆☆

www.urduacademyts.com

صالحہ عابد حسین

صالحہ مصداق فاطمہ نام 1913 ء میں پانی پت میں پیدا ہوئیں۔ علمی اور تعلیمی ماحول میں پرورش پائی۔ ادبی سفر کا آغاز 1939ء کے آس پاس کیا۔ عابد حسین صاحب سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد صالحہ عابد حسین کے نام سے شہرت پائی۔

صالحہ عابد حسین نے کثیر تعداد میں مسائل اور موضوعات کو اپنی تحریروں میں شامل کیا ہے۔ ان میں سیاسی، سماجی، تحقیقی اور بچوں کے لیے کتابیں شامل ہیں۔ انہوں نے قریب 42 کتابیں تصنیف کیں جن میں ساز ہستی، نراس میں آس، ٹوٹکے، آتشِ خاموش عذرا، قطرے سے گہر ہونے تک، راہِ عمل، سلسلہ روز و شب اور حالی کی سوانح حیات اہمیت کی حامل ہیں۔ ''سفر زندگی کے لیے سوز و ساز'' ان کی سوانح ہے۔ ان کا انتقال 8 جنوری 1988ء کو دلی میں ہوا۔

صالحہ عابد حسین کی تحریریں سلیس، سادہ اور رواں ہوتی ہیں۔ وہ اپنے تجربات، مشاہدات اور احساسات کو پُر اثر اور شگفتہ انداز میں پیش کرتی ہیں۔ اپنے بے شمار مضامین، ناول اور دوسری تخلیقات کے ساتھ وہ اُردو ادب کا اٹوٹ حصہ ہیں۔

☆☆☆

www.urduacademyts.com

ہندوستان جنت نشان

کلام پاک میں سفر و سیاحت کی تاکید بار بار آتی ہے۔ اسلام نے سیاحت کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ ''علم حاصل کرو چاہے اس کے لیے چین جانا پڑے۔'' یہ مشہور حدیث بھی سیاحت کی تعلیم دیتی ہے!

لیکن جب میں یہ کچھ نہیں جانتی تھی تب سے سیر و سیاحت کی شوقین تھی۔ کیسے اور کب یہ شوق پیدا ہوا جانے۔ میرا بچپن جس ماحول میں گزرا وہاں سفر و سیاحت کا عورتوں کے ذہن میں خیال بھی پیدا نہ ہوسکتا تھا یہ اور بات ہے کہ شوہر، باپ یا بیٹے کی نوکری کے سلسلے میں پانی پت سے باہر قریب اور دور کے شہروں میں عورتیں اور لڑکیاں آیا جایا کرتی تھیں۔ میری والدہ بھی اس سلسلے میں میرٹھ، دلی، لکھنؤ، حیدرآباد وغیرہ جاتی آتی رہتی تھیں۔ مگر یہ میری پیدائش سے پہلے کی بات ہے۔ اب تو وہ کبھی کبھار ڈاکٹر رحمان یا ڈاکٹر انصاری کو دکھانے کے لیے جایا کرتی تھیں اور کبھی کبھی مجھے بھی کہ سب سے چھوٹی تھی ساتھ لے لیتی تھیں۔ باجی کی شادی کے بعد ان کے ساتھ دو تین بار میرٹھ بھی گئی۔ بھائی جان کی انگلینڈ سے واپسی کے بعد علی گڑھ میں سکونت ہی اختیار کرلی گئی تھی اور اسی زمانے میں ایک بار شملہ، ایک بار کمارہٹی اور ایک بار گھوڑا کھال، اماں کے علاج کے سلسلے میں جانا ہوا تھا۔ بھائی جان کی شادی کے بعد دو بار نینی تال بھی گئی۔ جیسا کہ میں نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے، اماں کے ساتھ عراق کی زیارات کے لیے بھی جانا ہوا تھا۔ یہ سب سفر و سیاحت کی خاطر نہ تھے پھر بھی جہاں ہم جاتے تھوڑی بہت سیر تو کر ہی لیتے تھے۔ لیکن ہندوستان کی سیر اور باہر کے ملکوں کی سیاحت کے مواقع مجھے دراصل شادی کے بعد ملے اور میں نے اپنی محدود آمدنی اور وسائل کے باوجود دل کھول کر سیر و سفر کیا۔

www.urduacademyts.com

شادی کے بعد میں نے اپنے شوہر سے ایک ہی فرمائش کی تھی کہ مجھے سیاحت کا بہت شوق ہے اور انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ ہم دونوں انشاء اللہ نہ صرف ہندوستان دیکھیں گے بلکہ باہر کے ملکوں کی سیاحت بھی کریں گے۔ اُس وقت تو بیماریوں نے گھیر لیا اور کئی برس تک میں دلی سے باہر جانے کے قابل بھی نہ تھی لیکن گذشتہ اڑتیس چالیس سال میں، میں نے ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی جتنی سیاحت کی وہ میرے طبقے اور میری حیثیت کی عورتوں کے نصیب میں بہت کم آتی ہے۔

۳۶ء کے بعد میری صحت کی کمزوری کی وجہ سے عابد صاحب گرمی میں دلی سے باہر کسی پہاڑی مقام پر جانے کا پروگرام بنایا کرتے تھے۔ زمانہ سستا تھا۔ کرائے کم تھے۔ پہاڑ پر ٹھیرنے کا انتظام کسی دوست کی وساطت سے مفت یا بہت کم پیسوں میں ہوجاتا تھا۔ وہاں جاکر ہم دونوں لکھنے کا کام بھی کرتے اور سیر بھی۔ اسی طرح میں نے ہندوستان کے مشہور پہاڑی مقامات دیکھے۔ شملہ چار یا پانچ بار گئی۔ نینی تال میں بھابی جان کا گھر تھا کئی بار وہاں جانا ہوا۔ دوبار رانی کھیت کی بھی سیر کی۔ وہاں سے الموڑا جانا بھی ہوا۔ مہابلیشور تین دن جاکر رہے جہاں عابد صاحب کسی کانفرنس میں گئے ہوئے تھے۔ یہ بڑا ہی سرسبز، پُر فضا اور دلکش مقام ہے۔ لیکن سب سے زیادہ سیر میں نے کشمیر کی کی ہے۔ بھائی جان وہاں ڈائرکٹر تعلیمات ہوکر گئے تو پہلے ہی سال ہم دونوں کو ساتھ لے گئے اور پھر ہر سال (چھ یا سات بار ہم دو ڈھائی مہینے گرمی کے ان کے ساتھ جاکر گزارتے تھے۔ اس سات سال میں ہم نے کم و بیش سارے کشمیر کی سیر کر ڈالی۔ بھائی جان کو خود شوق بھی تھا اور ان کے فرائض منصبی میں بھی تھا کہ وہ دورہ کریں اور وہ مجھے اور بھابی جان اور عابد صاحب کو ساتھ لے کر جاتے تھے۔ سری نگر اور اس کے آس پاس کے علاقے تو چھان ہی ڈالے۔ اس کے علاوہ پالم پور، سون مرگ، یوس مرگ، مانس بل جھیل (جس کے چاروں طرف کنول کے پھولوں کے تختے اُسے عجیب حسن بخشتے ہیں) اچھا بل ککر ناگ، اننت ناگ کے آب

www.urduacademyts.com

حیات کے سے چشمے دیکھے۔ ان کا ٹھنڈا میٹھا پانی پیا اور ان کے حسن سے آنکھوں کو تراوٹ بخشی۔ وائل کا جھولتا پل خود ایک عجیب چیز ہے اور پھر دریا کا حسن اور اس کے رنگ برنگے پتھر جو جواہرات کو مات کرتے ہیں۔ اننت ناگ کی جھیل مقدس مانی جاتی ہے۔ اس کے پاس ایک مشہور قدیم مندر بھی ہے جس کی پوجا کے لیے لوگ ہر وقت آتے رہتے ہیں اور مچھلیوں چیونٹیوں اور پنڈتوں کو کھلاتے اور دکھشنا دیتے رہتے ہیں۔ اس سے آگے چل کر مٹن کا مشہور شہر ہے جس کی ایک اونچی پہاڑی پر جو بہت ہی سرسبز و حسین ہے ڈاک بنگلہ بنا ہوا ہے جس میں جا کر ہم لوگ کئی دن رہے اور میلوں آس پاس سیر کرتے رہے تھے۔ جموں کے راستے سری نگر جاتے آتے کئی بار ویری ناگ جھیل کو دیکھا حسب دستور مغلوں نے اس کے گرد بھی ایک وسیع و حسین باغ بنوادیا تھا۔ اس جھیل کی گہرائی کی کوئی حد نہیں ہے۔ اسی سے دریائے جہلم نکلتا ہے ہزاروں برس سے کروڑوں ٹن پانی اس میں بہتا رہتا ہے اور دریائے جہلم میں کبھی پانی کی کمی نہیں ہوتی۔ اس گول جھیل کے پانی کے اندر ہاتھ ہاتھ بھر کی لاکھوں مٹیالے رنگ کی مچھلیاں موجود ہیں جو ذرا سے چنے یا کھانے کی کوئی چیز ڈالو تو سینکڑوں کی تعداد میں اس پر جھپٹتی ہیں۔ اکثر مسافر اس کو بھی مقدس مانتے اور اس کے گرد طواف کرتے رہتے ہیں۔ یوں تو کشمیر کا چپہ چپہ جنت ارضی معلوم ہوتا ہے لیکن مجھے پہل گام سب سے زیادہ پسند ہے۔ اس کی سیر سے کبھی جی نہیں بھرتا۔ پہاڑوں کی شان و شوکت و سرسبزی اور درختوں اور پھولوں کی شادابی، دریا سے لدر کا بے مثال حسن، جس کے موتی جیسے شفاف پانی نے اس چھوٹی سی وادی کو سچ مچ وادی مینوا سا بنادیا ہے۔ پہل گام سے اوپر اونچی پہاڑیوں پر جائیے تو اور شاندار اور خوبصورت مناظر ملتے ہیں۔ آڑو اور چندن واڑی کی بلندیوں پر تو ہم سب گئے ہیں اور راستے میں تڑپتا ہوا چشموں کا سیماب اور بہتی ہوئی چاندی کی سی آبشاریں، اونچی اونچی برف پوش چوٹیاں اور گہری سرسبز وادیاں ایک طرف نظروں کو اسیر کرلیتی ہیں تو دوسری طرف گھوڑوں کے پھسل جانے کے ڈر سے خوف

www.urduacademyts.com

بھی معلوم ہوتا ہے۔ عابد صاحب تو ہر جگہ پیدل ہی جاتے تھے۔ چندن واڑی پہنچ کر دور تک چشمے پر جمی ہوئی برف سڑک کے مانند دیکھ۔ اس پر چلے، برف توڑ کر کھائی اور سردی سے جم جم گئے۔ امرناتھ یاترا کرنے کو بہت جی چاہتا تھا مگر یہاں تو یہ حال کہ ؎ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے، مگر دوسرے ساتھی شوقین نہ تھے۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ کبھی نہیں بھولتا۔ ایک بار ہم سری نگر سے کچھ دن جا کر پہل گام رہے تھے اور ککر ناگ کے صحت بخش پانی کے شوق میں عابد صاحب آٹھ دن وہاں بھی ٹھہرے تھے۔ واقعی ان پانچ حسین چشموں کا پانی اتنا لطیف، صحت بخش اور ہاضم تھا کہ ایک ہفتے میں عابد صاحب کا میرا، زہرا اور صابر کا (جو ہمارے ساتھ تھیں) کئی کئی پاؤنڈ وزن بڑھ گیا۔ کھانا ادھر کھایا ادھر ہضم یہاں ایک تو یہ نقشہ دیکھا کہ سری نگر کے ایک مسلمان کلکٹر صاحب پک نک کے لیے آئے تو اپنے ساتھ بوتلوں میں پکا پانی، سوڈا اور شراب لائے اور چشمے کا آب حیات چھوڑ کر وہ کڑوا زہر ذوق وشوق سے میز کرسی پر بیٹھے نوش جان کرتے رہے۔ دوسرا واقعہ واپسی پر بس میں پیش آیا۔ ہمارے قریب دلی کے دو سیٹھ بیٹھے تھے بہت بیزار اور نالاں فرمانے لگے ''یار بڑی تعریفیں سنی تھیں اس کشمیر کی۔ سری نگر دیکھا، پہل گام دیکھا گل مرگ دیکھا، یہاں ہے کیا سوائٹو اور پٹو کے۔'' اور میں ان کو دیکھتی رہ گئی سچ ہے: فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

گل مرگ کئی بار گئے۔ زمردیں پیالے کی سی نو ہزار فیٹ کی بلندی پر یہ وادی حسن و شادابی کا بڑا ہی دلکش منظر پیش کرتی ہے۔ اس سے تین میل نیچے ٹنگ مرگ کی وادی ہے جس کا چشمہ دریا کے برابر چوڑا ہے اور ایسے ایسے رنگ ایسے ایسے منظر دکھاتا ہے کہ سبحان اللہ تیری قدرت بے اختیار منہ سے نکلتا ہے۔ دریا، چشمے، سمندر بہتا پانی میری کمزوری ہے۔ اس کا حسن مجھے مسحور کر دیتا ہے۔ گل مرگ سے تین میل پتلی پگڈنڈیوں پر پیدل یا ٹٹو پر سوار ہو کر کھلن مرگ جاتے ہیں یہاں برف جمی ملتی ہے اور ایک طرف دور

www.urduacademyts.com

سری نگر کی وادی اور دوسری طرف ہمالیہ کی سر بفلک برف کا تاج پہنے مشہور چوٹیاں نظر آتی ہیں۔ یہاں کی ہوا ہلکی ہے۔ میرا سانس رکتا محسوس ہوتا تھا مگر اس وقت ان باتوں کی پروا کسے تھی۔ واپسی نہ صرف کھلن مرگ سے گل مرگ بلکہ وہاں سے ٹنک مرگ تک دوڑتے بھاگتے پیدل ہوتی تھی۔ جیسا میں نے کہا عابد صاحب تو ہر چڑھائی اترائی پیدل ہی طے کرتے تھے۔ ایک بار ذاکر صاحب بھی ساتھ تھے۔ پہلے تو گھوڑے سے ڈرے اور نہیں بیٹھے مگر گھوڑے والے بھی بڑے ''مردم شناس'' ہوتے ہیں ساتھ ساتھ آنے لگے۔ ذاکر صاحب ذرا دور چڑھ کر ہانپ گئے اور مجبوراً گھوڑے پر بیٹھنا پڑا۔ بھائی جان نے پوچھا ''ذاکر صاحب کیا ہے۔'' فرمایا ''متفکر'' پھر بولے '' گھوڑے سے پوچھیے اس کا کیا حال ہے۔'' راستے بھر ان تینوں دوستوں میں نہایت پر لطف اور لطیف مذاق اور فقرے بازی ہوتی رہتی تھی۔

بھائی جان باندی پور کے دورے پر گئے تو میں، عابد صاحب، بھابی جان اور ان کی لڑکیاں سبھی ساتھ تھے۔ اس وقت یہ راستہ نیا نیا بنا تھا اور خطرناک تھا۔ سیدھی چڑھائیاں اور اُتار بعض وقت حادثے ہوجاتے تھے۔ راستے میں سیدین صاحب دیہاتی اسکول دیکھتے ہوئے، کشمیری مہمان داری کا لطف اٹھاتے ہوئے ولر جھیل پہنچے۔ یہ سیر یادگار رہے گی۔ ایک پہاڑی پر بھابی جان نے اپنا اسٹوو جلانے کی کوشش کی کہ بھائی جان کو ہر خوبصورت جگہ چائے کی خواہش ہونے لگتی تھی مگر جھیل کے اطراف سے آنے والی تند و تیز ہواؤں نے اسٹوو کو جلنے نہ دیا اور ہم سب چائے سے محروم رہے۔ خواہش تھی کہ ولر میں کشتی کی سیر کریں گے مگر دوپہر کے بعد اس کی لہریں خطرناک ہوجاتی ہیں۔ کشتی والے یہ خطرہ مول لینے کو تیار نہیں ہوئے۔ ولر جھیل بہت وسیع ہے۔ واقعی اس میں سمندر کی سی جھلک محسوس ہوتی ہے۔ ہم لوگ پہاڑیوں پر سے جھیل کا نظارہ کرتے رہے اور لطف اٹھاتے رہے۔ کئی میل پیدل تیز دھوپ میں چل کر ڈاک بنگلہ آئے اور کھانے وغیرہ کے بعد تیسرے پہر سری نگر روانہ

www.urduacademyts.com

ہوئے۔ چند لوگ موٹر میں باقی سب بس میں۔ عابد صاحب اس بار بس میں بیٹھے۔ میں بھائی جان کے ساتھ تھی۔ ہم لوگ رات کے قریب پہنچ گئے مگر بس نہ اب آتی ہے نہ تب۔ راستہ کتنا خطرناک ہے یہ دیکھ ہی آئے تھے۔ رات گہری ہوتی جارہی تھی اور مسافروں کا پتا نہ تھا۔ بھابی جان بہت وہمی تھیں اور سخت فکر مند۔ مگر میرے تو دم پر بنی ہوئی تھی۔ یہ اندیشہ سانپ کی طرح پھن اٹھا رہا تھا کہ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔ دعائیں مانگتے مانگتے زبان تھک چکی تھی مگر آنکھ سے آنسو نہ نکالتی تھی۔ ساڑھے دس یا گیارہ بجے یہ لوگ خیر سے واپس آئے تو مجھ پر گریہ کا ایسا شدید حملہ ہوا کہ بے ہوش ہونے کے قریب ہوگئی۔ اس زمانے میں میری یہ حالت تھی کہ پریشانی دور ہونے کے بعد رونے کا زور ہوا کرتا تھا۔ اب عرصے سے اس پر قابو پا چکی ہوں۔

وادی لولاب کی سیر بھی بھائی جان کے دورے کے سلسلے میں کی۔ ریاست میں اسکولوں کو دیکھتے، کشمیری مہمان نوازی سے لطف اٹھاتے (جس میں بھائی جان اور میں اکثر بھوکے رہ جاتے تھے کہ کشمیری کھانا ہم سے کھایا نہ جاتا تھا، ہم لوگ وادی لولاب پہنچے۔ ہم اس لولاب کی تلاش میں آئے تھے جس کے لیے اقبال نے کہا ہے۔

پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب ۔ اے وادی لولاب

مگر یہاں وادی خشک پڑی تھی۔ چشموں میں نل سے بھی پتلی دھار کہیں کہیں نظر آتی تھی اور بس کہ اس سال بارش نہ ہوئی تھی۔ یوں تو کشمیری حسینائیں ہر جگہ نظر آتی ہیں مگر یہاں یہ حسن کچھ اور بھی بڑھا ہوا ہے۔ ایک بچی یہاں ایسی دیکھی جس کی موہنی صورت آج بھی میرے دل پر نقش ہے۔ کوئی سات آٹھ برس کی بچی، میلا سا ڈھیلا پھرن پہنے اور ٹوپی میں چاندی یا گلٹ کے کشمیری چاند سورج اٹکائے، کانوں میں بالیوں کے گچھے لٹکائے ہماری کار کے پاس کھڑی ہوگئی اور بچے ''پوسہ'' ''پوسہ'' مانگ رہے تھے اور وہ خاموش کھڑی تھی۔ نہایت حسین کھلتا ہوا گیہواں رنگ سیاہ غزالی آنکھیں، آدھے چاند کا سا ماتھا، کشمیری

www.urduacademyts.com

سیب کے سے سرخ گال اور گلاب کی پنکھڑی کے سے ہونٹ۔ کیا پیارا چہرہ تھا۔ کتنی معصومیت اور ساتھ ہی وقار تھا اس حسین میں۔ اُسے دیکھ کر بے اختیار یہ جی چاہا کہ اسے گود میں اٹھا کر موٹر میں بیٹھ جاؤں اور اُسے اغوا کرلاؤں۔ کاش یہ میری بچی ہوتی۔ گڈری کے اس لال کی یاد آج تک آتی ہے۔

کہاں تک بیان کروں کہ کشمیر کے اس سات سال کے قیام میں میں نے کتنی سیر کی اور کیا کیا دیکھا۔ یوں تو بھائی جان کے آنے کے بعد بھی میں تین بار کشمیر گئی مگر سیر و سیاحت نہیں کی کہ نہ وہ دل رہا تھا نہ صحت۔ ہر جگہ ان کی کمی اس شدت سے محسوس ہوتی کہ دل الٹنے لگتا تھا۔ فطرت کے حسن سے اب بھی متاثر ہوتی ہوں۔ حسین نظارے اب بھی مسحور کر لیتے ہیں مگر بس دم بھر کے لیے۔ اب نہ وہ ولولہ ہے نہ وہ امنگ نہ شوق ۔ دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا۔

پہاڑوں کے علاوہ میدانی علاقوں کی سیر بھی میں نے خوب خوب کی۔ دیہات اور گانو نسبتاً کم دیکھے اور شہروں میں زیادہ گئی۔ پانی پت کے آس پاس کا علاقہ کرنال، انبالہ، حصار، رہتک، گوڑ گاؤں وغیرہ کئی بار جانا ہوا۔ پنجاب میں امرتسر، جالندھر، گوجرانوالہ، سیال کوٹ، لاہور، راولپنڈی وغیرہ تقسیم ہند سے پہلے ہی جا چکی تھی۔ پونا ایک بار تو چند دن کے لیے سیر کو گئی تھی۔ پھر ۴۷ء میں چار ماہ بھائی جان کے ساتھ وہاں رہنا ہوا۔ مغربی گھاٹ کی یہ ننھی ننھی پہاڑیاں ان پر بسا یہ شہر اور آس پاس کا سرسبز علاقہ دیکھنے کے قابل ہے۔ بمبئی تو بیسیوں بار گئی ہوں۔ میرے چھوٹے بھائی جان کو بمبئی بہت پسند تھا۔ کہا کرتے تھے۔ ''بمبئی شہر نہیں عادت ہے۔'' ان کی دلچسپی کی سب چیزیں اسی شہر میں تھیں۔ دوست، ریس کے میدان، کریکٹ کلب، خود ان کا گھر۔ مگر مجھے اس کی ''عادت'' کبھی نہ پڑی اگرچہ پیاروں کی خاطر اکثر جانا ہوتا تھا۔ شروع میں پورے بمبئی اور اس کے آس پاس کی سیریں بھی خوب کیں مگر چند دن سے زیادہ وہاں جی نہ لگتا تھا۔ وہاں کا شور وغل میری برداشت سے

www.urduacademyts.com

باہر تھا۔ لیکن بمبئی کا سمندر، گیٹ وے آف انڈیا ، جوہو، چوپاٹی' میرین ڈرائیو، ہینگنگ گارڈن مجھے بہت پسند ہیں اور سمندر میں ڈوبتے اور طلوع ہوتے (جی ہاں دونوں نظر آسکتے ہیں) سورج کا نظارہ، اوشا کی کرنوں سے چمکتے مچھیروں کی کشتیوں کے بادبان جو دور بحر ہند میں مچھلیاں پکڑتے ہوتے، میری نظروں کو باندھ لیتے تھے جو ہو پر سمندر کا جوار بھاٹا، تاڑ کے درختوں میں سے جھانکتا پورا چاند اور سمندر پر جوار بھاٹے کا نظارہ، یہ سب میری دلچسپی کی چیزیں تھیں اور ہیں اور اب بمبئی میرے لیے بہت پیارا ہوگیا ہے کہ اس کی خاک میں، میرے جان سے پیارے بھائی اور میری دوست، دو بہنیں جو دوست اور بھاوج بھی تھیں منہ چھپائے سو رہے ہیں۔ ان کی آرام گاہوں کی کشش اب بھی مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔

بھوپال عابد صاحب کا وطن ثانی تھا۔ وہاں تین بار گئی اور صرف بھوپال ہی کی نہیں آس پاس کی سیر بھی کی۔ بھائی صاحب اور بہن اس کے مضافات میں رہتے تھے اور اسی وجہ سے اس کا بہترین اور خوبصورت علاقہ دیکھنے کا موقع ملا۔ وسط ہند کے پلیٹو پر بسی اس قدیم ریاست کا اپنا الگ جغرافیہ بھی ہے اور تاریخ بھی۔ یہاں حکومت کئی پشتوں تک مسلمان بیگموں کے ہاتھ میں رہی اور انہوں نے نہ صرف اپنی ریاست میں نظم و ضبط، تعلیم اور روشن خیالی پھیلانے کی جدوجہد کی بلکہ سلطان جہاں بیگم نے پورے ہندوستان کی مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کی کوشش میں اہم رول ادا کیا۔ یہ شہر دو چھوٹی بڑی جھیلوں، چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں، خوبصورت مساجد اور عمارات اور سانچی ٹوپ کی وجہ سے اپنا ایک الگ حسن و مقام رکھتا ہے۔

اگر بھوپال کے تال نے اس کے حسن میں چار چاند لگا دیے ہیں تو اس کے محل ریاض منزل نے اُس کی اہمیت اور احترام بڑھادیا ہے جس میں میرے دو محترم بزرگ فرزندِ سرسید راس مسعود اور ڈاکٹر محمد اقبال رہے تھے اور جہاں میرے بھائی جان نے اپنے

www.urduacademyts.com

ان محترم دوستوں کی رفاقت کا لطف اُٹھایا تھا۔

چند سال پہلے جب میں چوتھی بار بھوپال گئی تو تاج المساجد کی شان وشوکت دیکھ کر حیران رہ گئی اور سرعقیدت سے جھک گیا۔ اسی زمانے میں لڑکیوں کے کالج میں مجھے مدعو کیا گیا۔ یہ کالج ایک پرانے شاہی محل میں واقع ہے جو آدھا تال کے اوپر بنا ہوا ہے اور آدھا زمین پر۔ اس کے علاوہ لڑکیوں اور ان کی استانیوں کی عقیدت ومحبت اور خلوص نے مجھے گرویدہ کرلیا۔ ایک بار سیفیہ کالج میں بھی مجھے اور عابد صاحب کو بڑی محبت سے مدعو اور گرم جوشی سے استقبال کیا گیا تھا۔ وہاں جو تقریر میں نے کی تھی بعض نکتہ نواز اب تک اس کی تعریف کرتے ہیں۔ ایک بار میں اپنی جان ہار دوست صفیہ جاں نثار کے ہاں جاکر دو دن رہی تھی۔ اس وقت بھی وہاں کے کالج میں مجھے کہانی پڑھنے کے لیے بلایا گیا اور لڑکے لڑکیوں نے بڑی گرم جوشی اور خلوص سے میری پذیرائی کی تھی۔ بھوپال کی یاد کے ساتھ صفیہ کی یاد بھی وابستہ ہوگئی ہے۔

پہلی بار بھوپال سے واپسی پر آگرے کی سیر بھی کی تھی۔ علاوہ تاج کے قلعہ اور دوسری تاریخی اور مذہبی عمارات بھی دیکھیں۔ تاج کو دن میں بھی دیکھا اور چاندنی رات میں بھی۔ پہلی بار تاج کو دیکھ کر جو اثر ہوتا ہے، جس طرح انسان مسحور ہوجاتا ہے محبت اور عقیدت کا یہ شاہ کار جس طرح دل میں بس جاتا ہے اُسے محسوس کیا جاسکتا ہے بیان نہیں۔ اس کے بعد آگرے جاکر چار پانچ بار میں نے تاج کو دیکھا ہے۔ اس پر کندہ کلام پاک کی سورتیں پڑھی ہیں اور ان فن کاروں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے جنہوں نے یہ کمال دکھایا ہے۔ تاج کی جالیوں کی نفاست اور باریکیوں پر سر دھنا ہے، اس کے گنبد اور میناروں غرض ہر ہر چیز کو دیکھا ہے اور سوچا ہے کہ انسان کی حسن کاری، نفاست اور محنت کا اس سے بڑھ کر شاہ کار شاید کوئی اور نہیں ہوگا۔ یہ عمارت نہیں ایک ٹوٹے ہوئے محبت بھرے جسم کی آرزو مجسم ہوگئی ہے۔ یہ عمارت نہیں

www.urduacademyts.com

ہندوستان کے مزدروں اور معماروں نے حسن کا مسجمہ تراشا ہے جس میں اپنے خون جگر اور ماتھے کے پسینے کی گرمی اور سرخی ملاکر اُسے جاوداں بنادیا ہے۔ خدا نے انسان کو حسن شناسی ،حسن تراشی، حسن پرستی کی جولازوال نعمتیں ودیعت کی ہیں ان پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ اہل دل اور صاحبان کمال اُسے دیکھ کر انسان اور خدا دونوں پر ایمان لانے پر مجبور ہوسکتے ہیں۔ اگرکوئی بے حس یہ کہہ کر تاج کی عظمت کم کرنا چاہے کہ۔

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

تو وہ صرف شہنشاہ کی محبت کا ہی نہیں ان ہزاروں فن کاروں کی عظمت کا بھی مذاق اڑاتا ہے جن کی کاوش نے حسن کا یہ مندر تعمیر کیا تھا۔

آگرے اور تاج کے ساتھ مجھے اجنتا اور ایلورا کی سیر یاد آگئی۔ میرے دل میں عرصے سے وہاں جانے کی تمنا تھی۔ عابد صاحب تو پہلے کئی بار جا چکے تھے مگر ایک سال میری خاطر پھر وہاں گئے۔ پہلے تو ہم نے اورنگ آباد ٹھہر کر اس تاریخی شہر کی تاریخی عمارتوں اور حیرت انگیز چیزوں کی سیر کی۔ ''بی بی کا روضہ'' چھوٹا سا تاج محل کہا جاسکتا ہے۔ حسینی صاحب آرٹسٹ ایک عرصہ تک جامعہ ملیہ میں رہ چکے تھے۔ وہ اورنگ آباد میں ملے اور ان کے ساتھ ہم اجنتا، ایلورا دیکھنے کے لیے گئے۔ پہلے اجنتا گئے۔ کار میں چند گھنٹوں میں وہاں پہنچ گئے جس پہاڑی پر وہاں رسٹ ہاؤس واقع ہے اس کے آس پاس کا قدرتی منظر بہت ہی دلکش ہے۔ میں نے یہ بات محسوس کی کہ ہمارے ہندوستانی رُشی منیوں نے جہاں بھی عبادت گاہیں یا خانقاہیں بنوائیں تو سرسبز اور قدرتی حسن سے مالا مال علاقے چنے ہیں۔ دنیا کی سب لذتیں ترک کردیتے تھے مگر حسن قدرت سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیتیں ان میں غیر معمولی تھیں۔ میں نے اجنتا ایلورا کی سیر کے بعد ایک طویل مقالہ ''اجنتا کے گم نام امرفن کاروں کے نام'' لکھا تھا جو رسالہ آج کل نے شائع کیا تھا۔ یہاں ایک آدھ صفحے

www.urduacademyts.com

میں اس کا ذکر کیسے کیا جاسکتا ہے۔ بس یہ کہوں گی کہ جس ہندوستانی نے قدیم ہندوستان کے آرٹ کے ان سچ مچ بے مثال نمونوں کو نہیں دیکھا وہ بہت بڑی دولت سے محروم رہا۔ پتھر میں ترشے اور دیواروں پر نقش صنم تراشی اور مصوری کے یہ شاہکار فن کاروں کی عقیدت اور محبت کو فن میں سمونے کا ایک نادر کارنامہ ہیں جن کی مثال شاید دنیا میں نہ مل سکے گی۔ ایک ایک تصویر زبان بے زبانی سے کتنی داستانیں دہراتی ہے۔ فن کاروں کی بے پایاں عقیدت، گہرے فن کارانہ شعور اور ان تھک محنت کے امتزاج ہی سے ایسا آرٹ وجود میں آسکتا ہے جو ہزاروں برس تک باقی رہے۔ ایلورا میں صنم تراشی اور محنت و عقیدت کا اس سے بڑھ کر کمال نظر آتا ہے۔ مذہبی اساطیر کو پتھر میں یوں تراشا گیا ہے کہ انسان منہ کھولے محو حیرت بنے بس دیکھتا رہ جاتا ہے۔ ہزاروں برس پرانا مندر کیلاش دیکھیے انسانی ہاتھوں نے اپنی شردھا کو کلا کے روپ میں ڈھال دیا ہے اس کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یہ وہ کلا ہے جسے صرف عشق جنم دے سکتا ہے!

حیدرآباد بھی ان مقامات میں سے ہے جن کو دیکھنے کی بچپن سے آرزو تھی کہ پانی پت میں ہمارے خاندان کی ایک شاخ کے کچھ افراد وہاں نوکر تھے۔ ان کی لڑکیوں نے وہاں اعلیٰ تعلیم پائی تھی، وہاں کا لباس پہنتی تھیں اور وہاں کے قصے سن کر پریوں کے دیس کا سا سماں بندھ جاتا تھا۔

میرے والد بھی ایک عرصے تک حیدرآباد میں رہے تھے۔ وہ گلبرگہ میں جج کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ بھائی جان اور بھابی جان بھی وہاں گئے تو انہوں نے بھی اس شہر کی اور وہاں کے لوگوں کی بہت تعریف کی۔ عابد صاحب تو بارہا جا چکے تھے مگر عرصے تک میری یہ تمنا پوری نہ ہوئی۔

کوئی بیس بائیس سال پہلے، ایک گرمی میں ہم نے وہاں جانے کا پروگرام بنایا۔ اور بھائی جان نے نواب مہدی نواز جنگ کو لکھا کہ میری بہن اور عابد صاحب وہاں آئیں

www.urduacademyts.com

گے آپ ان کو اپنے ہاں ٹھہرائیے۔

دلی سے روانہ ہوئے۔ بڑا لمبا سفر تھا۔ ایک عجیب بات ہوئی بہت سویرے اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ جھانکا، گاڑی گلبرگہ کے اسٹیشن پر رکی ہوئی تھی۔ جتنی دیر گاڑی وہاں کھڑی رہی میں بڑی اپنائیت کے ساتھ اس اسٹیشن کو دیکھتی رہی۔ پاکستان بننے کے بعد جب پانی پت ہم سے چھوٹ چکا تھا، تو کشمیر، پٹیالہ اور انبالہ جاتے ہوئے ہر بار یہی واقعہ مجھے پانی پت کے اسٹیشن پر پیش آیا کہ اچانک تین یا چار بجے میری آنکھ کھل جاتی تھی۔ کوئی چھٹی حس تھی جو مجھے جگا دیتی تھی اور میں اپنے پانی پت کے اسٹیشن پر اتر کر اس کی پیاری سرزمین پر قدم رکھ کر تپتے دل کو تسلی دے لیا کرتی تھی۔ بعد میں تو خیر کئی بار پنجاب وقف بورڈ کی میٹنگ میں آتے یا جاتے اور دوبار حالی مشاعرے میں یا کسی اور کام سے خود پانی پت گئی ہوں گھومی ہوں۔ پرانے گھروں، مقدس زیارت گاہوں اور مسمار قبروں پر جا کر آنسو بہائے ہیں۔ دل و دماغ کو سکون بھی ملا ہے اور احساس درد میں تیزی بھی آئی ہے۔

حیدرآباد میں ہمارے محترم میزبانوں نواب و بیگم مہدی نواز جنگ نے جس محبت اور خلوص سے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور جس اپنائیت کا احساس دلایا اس کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ بس اتنا کہنا کافی ہے کہ ان کا گھر جتنی بار حیدرآباد یا احمد آباد کے ساتھ جا کر رہی ہوں، اپنا ہی گھر محسوس ہوا۔ اور اس سے بڑھ کر دنیا میں کسی گھر اور گھر والوں کی کیا تعریف کی جاسکتی ہے؟

مہدی بھائی کی بدولت میں نے حیدرآباد اور اس کے آس پاس کے سارے علاقے کی خوب سیر کی۔ اتنا ہی نہیں یہاں کی ہر طبقے کی زندگی ،تقریبات، اور رہن سہن کو دیکھا۔ یہاں کے لوگوں کے خلوص اور ادب نوازی سے متاثر ہوئی۔

جتنی بار میں حیدرآباد گئی ہوں وہاں کے ادیبوں، ادب نوازوں، قدر شناسوں اور میرے قاریوں نے میری پذیرائی کی ہے۔ میرے اعزاز میں جلسے کیے ہیں۔ دعوتیں

www.urduacademyts.com

کی ہیں، تقریریں کی ہیں۔ مجھ سے کہانیاں پڑھوائی اور تقریریں کرائی ہیں۔ صدارتیں کرائیں۔ اسکولوں کی طالبات اور ٹیچرز نے محبت اور خلوص سے بلایا ہے۔ مجالس عزا میں شرکت کی ہے۔ ایک بار تو ایک ہزار عورتوں کے مجمع میں امام حسین و حضرت زینب پر تقریر بھی کی تھی جس کو وہاں کی خواتین نے بے حد پسند کیا۔ لطف یہ کہ صاحب مجلس نے سوکا نوٹ بھی بعد میں مجھے بھیجا جس کو میں نے شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا۔

عثمانیہ یونیورسٹی کئی بار جاکر دیکھی۔ اس کی قدیم مرکزی عمارت اتنی خوبصورت شاندار نفیس ہے کہ بے اختیار میرے منہ سے نکلا کہ علم کا یہ مندر حیدرآباد کی سب سے خوبصورت چیز ہے۔ حیدرآباد کے آس پاس کے سارے ساگر دیکھے۔ گولکنڈہ کے قلعہ کو دوبار جاکر خوب گھوم پھر کر دیکھا اور مرعوب ہوئی۔ سالار جنگ میوزیم کی دوبار جاکر زیارت کی مگر تشنگی باقی رہی۔ ایک شخص نے ہزاروں نوواردات جن میں سے ہر ایک اپنے رنگ میں لاجواب ہے کس طرح جمع کر ڈالے یہ خود ایک حیرت ناک چیز ہے۔ وہاں کی مساجد اور امام باڑے بھی دیکھنے کے قابل ہیں۔ نوبت پہاڑ سے سارا شہر نظر آتا ہے۔ حیدرآباد میں بنجارہ ہلز پر یوں تو ہزاروں ایک سے ایک حسین و شاندار مکانات ہیں مگر مہدی نواز جنگ کا پتھروں سے تراشا گھر ان کے حسن ذوق کا نمونہ اور حیدرآباد شہر کے قدرتی حسن سے میل کھاتا ہوا ایک عجیب دلکش گھر ہے۔

حیدرآباد سے مجھے بڑی محبت ہے۔ ایسی کہ سوا دلی اور پانی پت کے کسی اور شہر سے یہ قربت حاصل نہیں ہوئی۔ مگر اپنے پیارے بھائی مہدی نواز جنگ کے بعد حیدرآباد ایسا لگتا ہے جیسے آگرہ بے تاج محل کے ہو جائے۔

☆☆☆

www.urduacademyts.com

مولانا الطاف حسین حالؔی

مرزا غالبؔ کے اخلاق وعادات و خیالات

مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے۔ وہ ہر ایک شخص سے جو اُن سے ملنے جاتا تھا بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ جو شخص ایک دفعہ اُن سے مل آتا تھا۔ اُس کو ہمیشہ اُن سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہوجاتے تھے اور اُن کی خوشی سے خوش اور اُن کے غم سے غمگین ہوتے تھے۔ اس لئے اُن کے دوست ہر ملت اور ہر مذہب کے نہ صرف دہلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے۔ جو خطوط اُنہوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں ان کے ایک ایک حرف سے مہر ومحبت وغمخواری و یگانگت ٹپکی پڑتی ہے۔ ہر ایک خط کا جواب لکھنا وہ اپنے ذمے فرض عین سمجھتے تھے۔ اُن کا بہت سا وقت دوستوں کے خطوں کے جواب لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی وہ خطوں کے جواب لکھنے سے باز نہ آتے تھے۔ وہ دوستوں کی فرمایشوں سے کبھی تنگدل نہ ہوتے تھے۔ غزلوں کی اصلاح کے سوا اور طرح طرح کی فرمایشیں اُن کے بعض خالص ومخلص دوست کرتے تھے اور وہ اُن کی تعمیل کرتے تھے۔ لوگ اُن کو اکثر بیرنگ خط بھیجتے تھے مگر اُن کو کبھی ناگوار نہ گذرتا تھا۔ اگر کوئی شخص لفافے میں ٹکٹ رکھ کر بھیجتا تھا تو سخت شکایت کرتے تھے۔

مروت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بدرجہ غایت تھا۔ باوجودیکہ اخیر عمر میں وہ اشعار کی اصلاح دینے سے بہت گھبرانے لگے تھے، با ایں ہمہ کبھی کسی کا قصیدہ یا غزل بغیر اصلاح کے واپس نہ کرتے تھے۔ ایک صاحب کو لکھتے ہیں ''جہاں تک ہو سکا احباب کی خدمت بجالایا۔ اوراقِ اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے، نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں کہ شاہ شرف بوعلی قلندر کو بسبب کبرسن

www.urduacademyts.com

کے خدا نے فرض اور پیمبر نے سنت معاف کردی تھی۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست بھی خدمت اصلاحِ اشعار مجھ پر معاف کریں۔ خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہوسکے گا لکھ دیا کروں گا۔ باوجود اس کے بھی لوگ مرزا کو برابر ستاتے رہتے تھے۔

اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل ان کے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا۔ ان کے مکان کے آگے اندھے لنگڑے لولے اور اپاہج مرد وعورت ہر وقت پڑے رہتے تھے۔ غدر کے بعد اُن کی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کی ہوگئی تھی، اور کھانے پینے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا۔ مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے۔ اس لئے اکثر تنگ رہتے تھے۔ غدر کے بعد ایک بار میں نے خود دیکھا کہ نواب لفٹننٹ گورنر کے دربار میں اُن کو حسب معمول سات پارچہ کا خلعت مع تین رقوم جواہر کے ملا تھا۔ لفٹنٹی کے چپراسی اور جمعدار قاعدے کے موافق انعام لینے کو آئے۔ مرزا صاحب کو پہلے ہی معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا۔ اس لئے انہوں نے دربار سے آتے ہی خلعت اور رقوم جواہر بازار میں فروخت کرنے کے لئے بھیج دی تھیں۔ چپراسیوں کو الگ مکان میں بٹھادیا اور جب بازار سے خلعت کی قیمت آئی تب اُن کو انعام دے کر رخصت کیا۔

وہ اپنے اُن دوستوں کے ساتھ جو گردش روزگار سے بگڑ گئے تھے نہایت شریفانہ طور سے سلوک کرتے تھے۔ دلی کے عمائد میں سے ایک صاحب۔ جو مرزا کے دلی دوست تھے، اور غدر کے بعد اُن کی حالت سقیم ہوگئی تھی۔ ایک روز چھینٹ کا فرغل پہنے ہوئے مرزا سے ملنے کو آئے۔ مرزا نے کبھی اُن کو مالیدہ یا جامہ وار وغیرہ کے چغوں کے سوا ایسا حقیر کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا۔ چھینٹ کا فرغل اُن کے بدن پر دیکھ کر دل بھر آیا۔ اُن سے پوچھا کہ چھینٹ آپ نے کہاں سے لی؟ مجھے اس کی وضع بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے، آپ مجھے فرغل کے لئے یہ چھینٹ منگوادیں۔ انہوں نے کہا یہ فرغل آج ہی بن کر آیا ہے، اور میں نے اسی وقت اس کو پہنا ہے، اگر آپ کو پسند ہے تو یہی حاضر ہے۔ مرزا نے کہا جی تو یہی چاہتا ہے کہ اسی وقت آپ سے چھین کر پہن لوں مگر جاڑا شدت سے پڑرہا ہے۔ آپ یہاں سے

www.urduacademyts.com

مکان تک کیا پہن کر جائیں گے؟ پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر کھونٹی پر سے اپنا مالیدہ کا نیا چغہ اُتار کر اُنھیں پہنا دیا اور اس خوبصورتی کے ساتھ وہ چغہ ان کی نذر کیا۔

جیسی مرزا کی طبیعت میں درا کی اور ذہن میں جودت اور سرعت انتقال تھی۔ اسی طرح ان کا حافظہ بھی نہایت قوی تھا۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ اُن کے گھر میں کتاب کا کہیں نشان نہ تھا، ہمیشہ کرایے کی کتابیں منگوا لیتے تھے، اور ان کو دیکھ کر واپس بھیج دیتے تھے مگر جو لطیف یا کام کی بات کتاب میں نظر پڑ جاتی تھی اُن کے دل پر نقش ہوجاتی تھی۔ فارسی کلام میں وہ کوئی لفظ یا محاورہ یا ترکیب ایسی نہیں برتتے تھے جس کی سند اہل زبان کے کلام سے نہ دے سکتے ہوں۔ کلکتے میں جن لوگوں نے اُن کے کلام پر اعتراض کئے تھے اور جن کے جواب میں مرزا نے مثنوی باد مخالف لکھی تھی، اُن کو مثنوی کے علاوہ ایک ایک اعتراض کے جواب میں دس دس بارہ بارہ سندیں اساتذہ کے کلام سے لکھ کر علحدہ بھیجی تھیں۔

مرزا کی تقریر میں اُن کی تحریر اور اُن کی نظم و نثر سے کچھ کم لطف نہ تھا اور اسی وجہ سے لوگ اُن سے ملنے اور اُن کی باتیں سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ وہ زیادہ بولنے والے نہ تھے۔ مگر جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا تھا لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر اُن کو بجائے حیوان ناطق کے حیوانِ ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔ حسنِ بیان، حاضر جوابی، اور بات میں سے بات پیدا کرنا ان کی خصوصیات میں سے تھا۔ ایک دفعہ جب رمضان گذر چکا تو قلعے میں گئے۔ پادشاہ نے پوچھا مرزا تم نے کتنے روزے رکھے، عرض کیا پیر و مرشد ایک نہیں رکھا۔

مکان کے جس کمرے میں مرزا دن بھر بیٹھتے اُٹھتے تھے وہ مکان کے دروازے کی چھت پر تھا، اور اُس کے ایک جانب ایک کوٹھری تنگ و تاریک تھی جس کا دراس قدر چھوٹا تھا کہ کوٹھری میں بہت جھک کر جانا پڑا تھا، اس میں ہمیشہ فرش بچھا رہتا تھا اور مرزا اکثر گرمی اور لو کے موسم میں دس بجے سے تین چار بجے تک وہاں بیٹھتے تھے۔ ایک دن جبکہ رمضان کا مہینہ اور گرمی کا موسم تھا۔ مولانا آزردہ ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے کو چلے آئے۔ اس

www.urduacademyts.com

وقت مرزا صاحب اسی کوٹھڑی میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے۔ مولانا بھی وہیں پہونچے اور مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگے کہ ''ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے، مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہوگیا'' مرزا نے کہا ''قبلہ! حدیث بالکل صحیح ہے، مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطاں مقید رہتا ہے وہ یہی کوٹھڑی تو ہے۔

الغرض مرزا کی کوئی بات لطف اور ظرافت سے خالی نہ ہوتی تھی۔ اگر کوئی اُن کے تمام ملفوظات جمع کرتا تو ایک ضخیم کتاب لطائف وظرائف کی تیار ہوجاتی۔

باوجودیکہ مرزا کی آمدنی اور مقدور بہت کم تھا، مگر خودداری اور حفظِ وضع کو وہ کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ شہر کے امراو عمائد سے برابر کی ملاقات تھی۔ کبھی بازار میں بغیر پالکی یا ہوادار کے نہیں نکلتے تھے۔ عمائد شہر میں سے جو لوگ اُن کے مکان پر نہیں آتے تھے، وہ بھی کبھی اُن کے مکان پر نہیں جاتے تھے اور جو شخص اُن کے مکان پر آتا تھا وہ بھی اُس کے مکان پر ضرور جاتے تھے۔ ایک روز کسی سے مل کر نواب مصطفٰے خان مرحوم کے مکان پر آئے، میں بھی اُس وقت وہاں موجود تھا، نواب صاحب نے کہا آپ مکان سے سیدھے یہیں آتے ہیں یا کہیں اور بھی جانا ہوا تھا، مرزا نے کہا مجھ کو ان کا ایک آنا دینا تھا، اس لیے اول وہاں گیا تھا، وہاں سے یہاں آیا ہوں۔

ایک دن دیوان فضل اللہ خاں مرحوم۔ چرٹ میں سوار۔ مرزا کے مکان کے پاس سے بغیر ملے نکل گئے۔ مرزا کو معلوم ہوا تو انہوں نے ایک رقعہ دیوان جی کو لکھا مضمون یہ ''کہ آج مجھ کو اس قدر ندامت ہوئی ہے کہ شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا نالائقی ہوسکتی ہے کہ آپ کبھی نہ کبھی تو اس طرف سے گذریں اور میں سلام کو حاضر نہ ہوں'' جب یہ رقعہ دیوان جی کے پاس پہنچا وہ نہایت شرمندہ ہوئے اور اُسی وقت گاڑی میں سوار ہوکر مرزا صاحب سے ملنے کو آئے۔

مرزا کی نہایت مرغوب غذا گوشت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی، وہ ایک وقت بھی بغیر

www.urduacademyts.com

گوشت کے نہیں رہ سکتے تھے، یہاں تک کہ مسہل کے دن بھی انہوں نے کھچڑی یا شولہ کبھی نہیں کھایا۔ اخیر میں اُن کی خوراک بہت کم ہوگئی تھی۔ صبح کو وہ اکثر شیرۂ بادام پیتے تھے۔ دن کو جو کھانا اُن کے لئے گھر میں سے آتا تھا۔ اس میں صرف پاؤ سیر گوشت کا قورمہ ہوتا تھا۔ ایک پیالے میں بوٹیاں، دوسرے میں لعاب یا شوربا، ایک پیالی میں ایک پھلکے کا چھلکا شوربے میں ڈوبا ہوا، ایک پیالی میں کبھی کبھی ایک انڈے کی زردی، ایک اور پیالی میں دو تین پیسہ بھر دہی، اور شام کو کسی قدر شامی کباب یا سیخ کے کباب بس اس سے زیادہ ان کی خوراک اور کچھ نہ تھی۔

ایک روز دوپہر کا کھانا آیا اور دستر خوان بچھا، برتن تو بہت سے تھے، مگر کھانا نہایت قلیل تھا۔ مرزا نے مسکرا کر کہا ''اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجئے تو میرا دستر خوان یزید کا دستر خوان معلوم ہوتا ہے اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھئے تو بایزید کا۔''

فواکہ میں آم اُن کو نہایت مرغوب تھا۔ آموں کی فصل میں اُن کے دوست دُور دُور سے اُن کے لئے عمدہ عمدہ آم بھیجتے تھے، اور وہ خود اپنے بعضے دوستوں سے تقاضا کر کے آم منگواتے تھے۔

ایک روز مرحوم بہادرشاہ آموں کے موسم میں چند مصاحبوں کے ساتھ جن میں مرزا بھی تھے۔ باغ حیات بخش یا مہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے۔ آم کے پیڑ رنگ برنگ کے آموں سے لدرہے تھے۔ یہاں کا آم بادشاہ یا سلاطین یا بیگمات کے سوا کسی کو میسر نہیں آسکتا تھا۔ مرزا بار بار آموں کی طرف غور سے دیکھتے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا ''مرزا اس قدر غور سے کیا دیکھتے ہو؟ مرزا نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا ''پیر و مرشد یہ جو کسی بزرگ نے کہا ہے'' برسر ہر دانہ بنوشتہ عیاں ۔ کایں فلاں ابن فلاں ابن فلاں ۔ اس کو دیکھتا ہوں کہ کسی دانے پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں۔ بادشاہ مسکرائے اور اُسی روز ایک بہنگی عمدہ عمدہ آموں کی مرزا کو بھجوائی۔

حکیم رضی الدین خاں جو مرزا کے نہایت دوست تھے' اُن کو آم نہیں بھاتے تھے۔

www.urduacademyts.com

ایک دن وہ مرزا کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے تھے اور مرزا بھی وہیں موجود تھے۔ ایک گدھے والا اپنے گدھے لئے ہوئے گلی سے گذرا۔ آم کے چھلکے پڑے تھے، گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیے۔ حکیم صاحب نے کہا دیکھئے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔ مرزا نے کہا بے شک گدھا نہیں کھاتا۔

مرزا کی نیت آموں سے کسی طرح سیر نہ ہوتی تھی۔ اہل شہر تحفتہً بھیجتے تھے، خود بازار سے منگواتے تھے' باہر سے دور دور کا آم بطور سوغات کے آتا تھا، مگر حضرت کا جی نہیں بھرتا تھا۔ نواب مصطفےٰ خاں مرحوم ناقل تھے کہ ایک صحبت میں مولانا فضل حق اور مرزا اور دیگر احباب جمع تھے اور آم کی نسبت ہر شخص اپنی اپنی رائے بیان کررہا تھا کہ اُس میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ جب سب لوگ اپنی اپنی کہہ چکے تو مولانا فضل حق نے مرزا سے کہا کہ تم بھی اپنی راے بیان کرو۔ مرزا نے کہا بھئی میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہئیں۔ میٹھا ہو اور بہت ہو۔ سب حاضرین ہنس پڑے۔

مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی۔ جو مقدار انہوں نے مقرر کرلی تھی اس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے۔ جس بکس میں بوتلیں رہتی تھیں اُس کی کنجی داروغہ کے پاس رہتی تھی، اور اس کو سخت تاکید تھی کہ اگر رات کو سرخوشی کے عالم میں مجھ کو زیادہ پینے کا خیال پیدا ہوتو ہرگز میرا کہنا نہ ماننا اور کنجی مجھ کو نہ دینا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کو کنجی طلب کرتے تھے، اور نشے کی جھانجھ میں داروغہ کو بہت بُرا بھلا کہتے تھے، مگر داروغہ نہایت خیر خواہ تھا ہرگز کنجی نہ دیتا تھا۔ اول تو وہ مقدار میں بہت کم پیتے تھے، دوسرے اس میں دو تین حصے گلاب ملا لیتے تھے جس سے اس کی حدت اور تیزی کم ہوجاتی تھی۔

☆☆☆

www.urduacademyts.com

مشتاق احمد یوسفی

مشتاق احمد یوسفی نے اردو مزاح کو ایک نئے مزاج سے آشنا کیا ہے۔ وہ ہنسی ہنسی میں کام کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ یوسفی کا مزاح شگفتہ و شاداب ہے۔ شستگی اس مزاح کا جوہر ہے۔ ان کا طرز بیان سرتاسر ادبیت، ذہانت اور برجستگی میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہ بات میں سے بات پیدا کرتے ہیں۔ ان کے مضامین میں تفکر و تفنن کا ایک خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ ان کے یہاں مشاہدے کی وسعت کا پتہ ان کی تحریر کے تیکھے پن سے چلتا ہے۔ وہ الفاظ کا مزاج پہچانتے ہیں اور لہجے کے اتار چڑھاؤ سے واقف ہیں۔ اسی لئے اُردو طنز و مزاح میں ایک نئی اور بھرپور آواز کا اضافہ ہوا ہے۔

مجنوں گورکھ پوری نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔ ''ادنیٰ سے ادنیٰ بات کے کسی نئے پہلو یا زاویئے پر ہلکی سی روشنی ڈال کر اس کی طرف ہم کو متوجہ کر کے چونکا دینا اور خود متصوفانہ انداز میں آگے بڑھ جانا یوسفی کے فن کی وہ نزاکت ہے جو انہیں کے حصے میں آئی ہے۔ یوسفی کا قلم جس چیز کو بھی چھوتا ہے اس میں نئی روئیدگی اور تازہ بالیدگی پیدا کر دیتا ہے۔ یوسفی ایک ظرافت نگار کی حیثیت سے ایک نیا دبستان ہیں۔''

''پڑیئے گر بیمار'' ان کی شاہکار اور نمائندہ تحریر ہے۔

''خاکم بدہن''، ''زرگزشت'' اور ''چراغ تلے'' ان کی مشہور کتابیں ہیں۔

☆☆☆

www.urduacademyts.com

پڑیئے گر بیمار.....

تو کوئی نہ ہو تیمار دار؟ جی نہیں! بھلا کوئی تیماردار نہ ہوتو بیمار پڑنے سے فائدہ؟ اور اگر مرجایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو؟ تو بہ کیجئے! مرنے کا یہ اکل کھرا دقیانوسی انداز مجھے کبھی پسند نہ آیا۔ ہوسکتا ہے کہ غالبؔ کے طرفدار یہ کہیں کہ مغرب کو محض جینے کا قرینہ آتا ہے، مرنے کا سلیقہ نہیں آتا اور سچ پوچھئے تو مرنے کا سلیقہ کچھ مشرق ہی کا حصہ ہے۔ اسی بنا پر غالبؔ کی نفاست پسند طبیعت نے ۱۲۷۷ھ میں وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا کہ اس میں ان کی کسر شان تھی۔ حالانکہ اپنی پیشین گوئی کو صحیح ثابت کرنے کی غرض سے وہ اسی سال مرنے کے آرزومند تھے۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے ہاں با عزت طریقے سے مرنا ایک حادثہ نہیں، ہنر ہے، جس کے لئے عمر بھر ریاض کرنا پڑتا ہے ۔ اور اللہ اگر توفیق نہ دے تو یہ ہر ایک کے بس کا روگ بھی نہیں۔ بالخصوص پیشہ ور سیاست دان اس کے فنی آداب سے واقف نہیں ہوتے۔ بہت کم لیڈر ایسے گزرے ہیں جنہیں صحیح وقت پر مرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ ہر لیڈر کی زندگی میں خواہ وہ کتنا ہی گیا گذرا کیوں نہ ہو ایک وقت ضرور آتا ہے جب وہ ذرا جی کڑا کر کے مرجائے یا اپنے سیاسی دشمنوں کو رشوت دے کر اپنے آپ کو شہید کرالے تو وہ لوگ سال کے سال نہ سہی ہر الیکشن پر ضرور دھوم دھام سے ان کا عرس منایا کریں۔ البتہ وقت یہ ہے کہ اس قسم کی سعادت دوسرے کے زورِ بازو پر منحصر ہے۔ اور سعدی کہہ گئے ہیں کہ دوسرے کے بل بوتے پر جنت میں جانا عقوبتِ دوزخ کے برابر ہے۔ پھر اس کا کیا علاج کہ انسان کو موت ہمیشہ قبل از وقت اور شادی بعد از وقت معلوم ہوتی ہے۔

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی ورنہ سردست مجھے ان خوش نصیب جواں مرگوں سے سروکار نہیں جو جینے کے قرینے اور مرنے کے آداب سے واقف نہیں۔ میرا تعلق تو اس مظلوم اکثریت سے ہے جس کو بقول شاعر ع

جینے کی ادا یاد، نہ مرنے کی ادا یاد

www.urduacademyts.com

چنانچہ اس وقت میں اس بے زبان طبقہ کی ترجمانی کرنا چاہتا ہوں جو اس درمیانی کیفیت سے گزر رہا ہے۔ جو موت اور زندگی دونوں سے زیادہ تکلیف دہ اور صبر آزما ہے۔ یعنی بیماری۔ میرا اشارہ اسی طبقہ کی طرف ہے جسے

سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے صحت کے سوا

میں اس جسمانی تکلیف سے بالکل نہیں گھبراتا جو لازمۂ علالت ہے۔ اسپرین کی صرف ایک گولی یا مارفیا کا ایک انجکشن اس سے نجات دلانے کے لئے کافی ہے۔ لیکن اس روحانی اذیت کا کوئی علاج نہیں جو عیادت کرنے والوں سے مسلسل پہنچتی رہتی ہے۔ ایک دائم المرض کی حیثیت سے جو اس درد لا دوا کی لذت سے آشنا ہے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مارفیا کے انجکشن مریض کے بجائے مزاج پرسی کرنے والوں کو لگائے جائیں تو مریض کو بہت جلد سکون آجائے۔

اردو شاعروں کے بیان کو باور کیا جائے تو پچھلے زمانے میں علالت کی غایت ''تقریب بہرِ ملاقات'' کے سوا کچھ نہ تھی۔ محبوب عیادت کے بہانے غیر کے گھر جاتا تھا اور ہر سمجھ دار آدمی اسی امید میں بیمار پڑتا تھا کہ شاید کوئی بھولا بھٹکا مزاج پُرسی کو آنکلے۔

علالت بے عیادت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

اس زمانے کے انداز عیادت میں کوئی دلنوازی ہوتو ہو میں تو ان لوگوں میں سے ہوں جو محض عیادت کے خوف سے تندرست رہنا چاہتے ہیں۔ ایک حساس دائم المریض کے لئے ''مزاج اچھا ہے'' ایک رسمی یا دعائیہ جملہ نہیں بلکہ ذاتی حملہ ہے جو ہر بار اسے احساس کمتری میں مبتلا کردیتا ہے۔ میں تو آئے دن کی پرسش حال سے اس قدر بیزار ہوچکا ہوں کہ احباب کو آگاہ کردیا ہے کہ جب تک میں بقلم خود یہ اطلاع نہ دوں کہ آج اچھا ہوں، مجھے حسب معمول بیمار ہی سمجھیں اور مزاج پرسی کرکے شرمندہ ہونے کا موقع نہ دیں۔

سنا ہے کہ شائستہ آدمی کی یہ پہچان ہے کہ اگر آپ اس سے کہیں کہ مجھے فلاں بیماری ہے تو وہ کوئی آزمودہ دوا نہ بتائے۔ شائستگی کا یہ سخت معیار صحیح تسلیم کرلیا جائے تو ہمارے ملک میں

www.urduacademyts.com

سوائے ڈاکٹروں کے کوئی اللہ کا بندہ شائستہ کہلانے کا مستحق نہ نکلے۔ یقین نہ آئے تو جھوٹ موٹ کسی سے یہ کہہ دیجئے کہ مجھے زکام ہوگیا ہے۔ پھر دیکھئے کیسے کیسے مجرب نسخے، خاندانی چٹکلے اور فقیری ٹوٹکے آپ کو بتائے جاتے ہیں۔ میں آج تک یہ فیصلہ نہ کرسکا کہ اس کی اصل وجہ طبی معلومات کی زیادتی ہے یا مذاق سلیم کی کمی۔ بہرحال بیمار کو مشورہ دینا ہر تندرست آدمی اپنا خوش گوار فرض سمجھتا ہے اور انصاف کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں ننانوے فیصد لوگ ایک دوسرے کو مشورے کے علاوہ اور دے بھی کیا سکتے ہیں؟

بعض اوقات احباب اس بات سے آزردہ ہوتے ہیں کہ میں ان کے مشوروں پر عمل نہیں کرتا حالانکہ ان پر عمل پیرا نہ ہونے کا واحد سبب یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ میرا خون کسی عزیز دوست کی گردن پر ہو۔ اس وقت میرا منشا صلاح اور مشورہ کے نقصانات گنوانا نہیں (اس لئے کہ میں دماغی صحت کے لئے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ انسان کو پابندی سے صحیح غذا اور غلط مشورہ ملتا رہے، اس کا ذہنی توازن قائم رہتا ہے) نہ یہاں ستم ہائے عزیزاں کا شکوہ مقصود ہے۔ مدعا صرف اپنے ان بہی خواہوں کو متعارف کرانا ہے جو میرے مزمن امراض کے اسباب وعلل پر غور کرتے اور اپنے مشورے سے وقتاً فوقتاً مجھے مستفید فرماتے رہتے ہیں۔ اگر اس غول میں آپ کو یہ جانی پہچانی صورتیں نظر آئیں تو میری خستگی کی داد دینے کی کوشش نہ کیجئے۔ آپ خود لائق ہمدردی ہیں۔

سرِفہرست ان مزاج پرسی کرنے والوں کے نام ہیں جو مرض تشخیص کرتے ہیں نہ دوا تجویز کرتے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ منکسر مزاج ہیں۔ دراصل ان کا تعلق اس مدرسۂ فکر سے ہے جس کے نزدیک پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ یہ اس شکم آزار عقیدے کے مبلغ کہ کھانا جتنا پھیکا سیٹھا ہوگا، صحت کے لئے اتنا ہی مفید ہوگا۔ یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ ہمارے ملک میں دواؤں سے خواص دریافت کرنے کا بھی یہی معیار ہے۔ جس طرح بعض خوش اعتقاد لوگوں کا ابھی تک یہ خیال ہے کہ ہر بدصورت عورت نیک چلن ہوتی ہے اسی طرح طبِ قدیم میں ہر کڑوی چیز کو مصفیٔ خون تصور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں انگریزی کھانے اور کڑوے

www.urduacademyts.com

قدح اسی امید میں نوش جاں کئے جاتے ہیں۔

اس قبیل کے ہمدردانِ صحت دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک وہ غذا رسیدہ بزرگ جو اسے علاج کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو علاج اور کھانے دونوں سے پرہیز تجویز فرماتے ہیں۔ پچھلی گرمیوں کا واقعہ ہے کہ میری بائیں آنکھ میں گوہانجنی نکلی تو ایک نیم جان جو خود کو پورا حکیم سمجھتے ہیں، چھوٹتے ہی بولے:

'' معدہ پر ورم معلوم ہوتا ہے۔ دونوں وقت مونگ کی دال کھایئے۔ دافعِ نفخ و محللِ ورم ہے۔''

میں نے پوچھا '' آخر آپ کو میری ذات سے کون سی تکلیف پہنچی جو یہ مشورہ دے رہے ہیں؟''

فرمایا ''کیا مطلب؟''

عرض کیا ''دوچار دن مونگ کی دال کھالیتا ہوں تو اُردو شاعری سمجھ میں نہیں آتی اور طبیعت بے تحاشا تجارت کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اس صورت میں خدانخواستہ تندرست ہو بھی گیا تو جی کے کیا کروں گا؟''

بولے : ''آپ تجارت کو اتنا حقیر کیوں سمجھتے ہیں؟ انگریز ہندوستان میں داخل ہوا تو اس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں ترازو تھی۔''

گذارش کی ''اور جب وہ گیا تو ایک ہاتھ میں یونین جیک تھا اور دوسری آستین خالی لٹک رہی تھی۔''

بات انہیں بہت بری لگی اس لئے مجھے یقین ہوگیا کہ سچ تھی۔ اس کے بعد تعلقات اتنے کشیدہ ہوگئے کہ ہم نے ایک دوسرے کے لطیفوں پر ہنسنا چھوڑ دیا۔ استعارہ اور کنایہ تو برطرف میرا اپنا عقیدہ تو یہ ہے کہ جب تک آدمی کو خواص کی غذا ملتی رہے اسے غذا کے خواص کے بکھیڑے میں پڑنے کی مطلق ضرورت نہیں۔ سچ پوچھئے تو عمدہ غذا کے بعد کم از کم مجھے تو بڑا انشراح محسوس ہوتا ہے اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ بڑھ کے ہر راہ گیر کو سینے سے لگالوں۔

www.urduacademyts.com

دوسرا گروہ قوتِ ارادی سے دوا اور غذا کا کام لینا چاہتا ہے اور جسمانی عوارض کے علاج معالجہ سے پہلے دماغ کی اصلاح کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ یہ حضرات ابتدائے مرض ہی سے دوا کے بجائے دعا کے قائل ہیں اور ان میں بھاری اکثریت ان سینترے بہنترے بزرگوں کی ہے جو گھگھیا گھگھیا کر اپنی درازیٔ عمر کی دعا مانگتے ہیں اور اس کو عینِ عبادت سمجھتے ہیں۔

اس روحانی غذا کے لئے میں فی الحال اپنے آپ کو تیار نہیں پاتا۔ مجھے اس پر قطعاً تعجب نہیں ہوتا کہ ہمارے ملک میں پڑھے لکھے لوگ خونی پیچش کا علاج گنڈے تعویذوں سے کرتے ہیں۔ غصہ اس بات پر آتا ہے کہ وہ واقعی اچھے ہوجاتے ہیں۔

کچھ ایسے عیادت کرنے والے بھی ہیں جن کے اندازِ پرسش سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیماری ایک سنگین جرم ہے۔ وہ کسی آسمانی ہدایت کے بموجب اس تفتیش پر مامور کئے گئے ہیں۔ پچھلے سال جب انفلوئینزا کی وبا پھیلی اور میں بھی صاحب فراش ہوگیا تو ایک ہمسائے جو کبھی پھٹکتے بھی نہ تھے کمرۂ علالت میں بہ نفس نفیس تشریف لائے اور خوب کرید کرید کر جرح کرتے رہے۔ بالآخر اپنا منھ میرے کان کے قریب لاکر راز دارانہ انداز میں کچھ ایسے نجی سوالات کئے جن کے پوچھنے کا حق میری ناچیز رائے میں بیوی اور منکر نکیر کے علاوہ کسی کو نہیں پہنچتا۔

ایک بزرگوار ہیں جن سے صرف دورانِ علالت میں ملاقات ہوتی ہے اس لئے اکثر ہوتی رہتی ہے۔ موصوف آتے ہی برس پڑتے ہیں اور گرجتے ہوئے رخصت ہوتے ہیں۔ پچھلے ہفتہ کا ذکر ہے۔ ہلہلا کر بخار چڑھ رہا تھا کہ وہ دھمکے۔ کپکپا کر کہنے لگے: ''بیماری آزاری میں بڑی غیریت برتتے ہو برخوردار! دو گھنٹے سے ملیریا میں چپ چاپ مبتلا ہو اور مجھے خبر تک نہ کی۔''

بہتیرا جی چاہا کہ اس دفعہ ان سے پوچھ ہی لوں کہ ''قبلہ کونین! اگر آپ کو بروقت اطلاع کردیتا تو آپ میرے ملیریا کا کیا بگاڑ لیتے؟''

ان کی زبان قینچی کی طرح ہے جو چلتی زیادہ اور کاٹتی کم ہے۔ ڈانٹنے کا انداز ایسا ہے جیسے کوئی کودن لڑکا زور زور سے پہاڑے یاد کررہا ہو۔ مجھے ان کی ڈانٹ پر ذرا غصہ نہیں آتا۔ کیوں کہ اب اس کا مضمون ازبر ہوگیا ہے۔ یوں بھی اس کینڈے کے بزرگوں کی نصیحت میں

www.urduacademyts.com

سے ڈانٹ اور داڑھی کو علیحدہ کردیا جائے یا بصورتِ نقص امن ڈانٹ میں سے ڈنک نکال دیا جائے تو بقیہ بات (اگر کوئی چیز باقی رہتی ہے) نہایت لغوی معلوم ہوگی۔

ان کا آنا فرشتہ موت کا آنا ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام روح قبض کرتے وقت اتنی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرتے ہوں گے۔ زکام انہیں نمونیہ کا پیش خیمہ دکھائی دیتا ہے اور خسرہ میں ٹائیفائڈ کے آثار نظر آتے ہیں۔ ان کی عادت ہے کہ جہاں محض سیٹی سے کام چل سکتا ہے وہاں بے دھڑک بگل بجادیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ایک ہی سانس میں خدانخواستہ انا اللہ تک کی تمام منزلیں طے کرلیتے ہیں۔ ان کی منظوم ڈانٹ کی تمہید کچھ اس قسم کی ہوتی ہے۔

''میاں! یہ بھی کوئی انداز ہے کہ گھر کے رئیسوں کی طرح ع

نبض پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

بیکاری بیماری کا گھر ہے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے ع

بیمار مباش کچھ کیا کر!''

مصرع کا جواب شعر سے دینا ہوگا ؎

کمزور میری صحت بھی، کمزور میری بیماری بھی

اچھا جو ہوا کچھ کر نہ سکا، بیمار ہوا تو مر نہ سکا

یہ سن کر وہ بپھر جاتے ہیں اور اپنے سن و سال کی آڑ لے کر کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان میں وہ بے نقط سناتے ہیں کہ زندہ تو درکنار مردہ بھی ایک دفعہ کفن پھاڑ کر سوال و جواب کے لئے اٹھ بیٹھے۔ تقریر کا لب لباب یہ ہوتا ہے کہ راقم الحروف جان بوجھ کر اپنی تندرستی کے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑا ہے۔ میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر خودکشی میرا منشا ہوتا تو یوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر نہ جیتا بلکہ آنکھ بند کرکے ان کی تجویز کردہ دوائیاں کھا لیتا۔

آیئے ایک اور مہربان سے آپ کو ملاؤں۔ ان کی تکنیک قدرے مختلف ہے۔ میرے صورت دیکھتے ہی ایسے ہراساں ہوتے ہیں کہ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ان کا معمول ہے کہ کمرے

www.urduacademyts.com

میں بغیر کھٹکھٹائے داخل ہوتے ہیں اور میرے سلام کا جواب دیئے بغیر تیمارداروں کے پاس پنجوں کے بل جاتے ہیں۔ پھر کھسر پھسر ہوتی ہے۔ البتہ کبھی کبھی کوئی اچٹتا ہوا فقرہ مجھے بھی سنائی دے جاتا ہے۔

''صدقہ دیجئے۔ جمعرات کی رات بھاری ہوتی ہے۔''

''پانی حلق سے اتر جاتا ہے۔''

''آدمی پہچان لیتے ہیں۔''

یقین جانئے۔ یہ سن کر پانی سر سے گذر جاتا ہے۔ اور میں تو رہا ایک طرف خود تیمار دار میری صورت نہیں پہچان سکتے۔

سرگوشیوں کے دوران ایک دفعہ میں نے خود دخل دے کر بقائمی ہوش و حواس عرض کرنا چاہا کہ میں بفضل تعالیٰ چاق و چوبند ہوں۔ صرف پیچیدہ دواؤں میں مبتلا ہوں۔ مگر اس مسئلہ کو قابل دست اندازی مریض نہیں سمجھتے اور اپنی شہادت کی انگلی ہونٹوں پر رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ میرے اعلان صحت اور ان کی پر زور تردید سے تیمارداروں کو میری دماغی صحت پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ یوں بھی اگر بخار سوڈگری سے اوپر ہوجائے تو میں ہذیان بکنے لگتا ہوں جسے بیگم، اقبال گناہ اور رشتہ دار وصیت سمجھ کر ڈانٹتے ہیں اور بچے ڈانٹ سمجھ کر سہم جاتے ہیں۔ میں ابھی تک فیصلہ نہیں کرسکا کہ یہ حضرت مزاج پرسی کرنے آتے ہیں یا پرسا دینے۔ ان کے جانے کے بعد میں واقعی محسوس کرتا ہوں کہ بس اب چل چلاؤ لگ رہا ہے۔ سانس لیتے ہوئے دھڑکا لگا رہتا ہے کہ روایتی ہچکی نہ آجائے۔ ذرا گرمی لگتی ہے تو خیال ہوتا ہے کہ شاید آخری پسینہ ہے۔ اور طبیعت تھوڑی بحال ہوتی ہے تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہوں کہ کہیں سنبھالا نہ ہو۔

لیکن مرزا عبدالودود بیگ کا انداز سب سے نرالا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ انہیں میری دلجوئی مقصود ہوتی ہے یا اس میں ان کے فلسفہ حیات و ممات کا دخل ہے بیماری کے فضائل ایسے دل نشین پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ صحت یاب ہونے کو دل نہیں چاہتا۔ تندرستی وبال معلوم ہوتی ہے اور غسل صحت میں وہ تمام قباحتیں نظر آتی ہیں جن سے غالب کو فکر وصال میں دوچار ہونا پڑا۔

www.urduacademyts.com

کہ گر نہ ہوتو کہاں جائیں، ہوتو کیوں کر ہو۔

اکثر فرماتے ہیں کہ بیماری جان کا صدقہ ہے۔ عرض کرتا ہوں کہ میرے حق میں تو یہ صدقہ جاریہ ہوکر رہ گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ۔ خالی بیمار پڑنے سے کام نہیں چلتا اس لئے کہ پسماندہ ممالک میں ع

فیضان علالت عام سہی، عرفان علالت عام نہیں

ایک دن میں کان کے درد میں تڑپ رہا تھا کہ وہ آ نکلے۔ اس افراتفری کے زمانے میں زندہ رہنے کے شدائد اور موت کے فیوض و برکات پر ایسی موثر تقریر کی کہ بے اختیار جی چاہا کہ انہیں کے قدموں پر پھڑ پھڑا کر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردوں اور انشورنس کمپنی والوں کو روتا دھوتا چھوڑ جاؤں۔ ان کے دیکھے سب میرے تیمارداروں کی منھ کی رہی سہی رونق جاتی رہتی ہے مگر میں سچے دل سے ان کی عزت کرتا ہوں کیوں کہ میرا عقیدہ ہے کہ محض جینے کے لئے کسی فلسفہ کی ضرورت نہیں لیکن اپنے فلسفہ کی خاطر دوسروں کو جان دینے پر آمادہ کرنے کے لئے سلیقہ چاہئے۔

چونکہ یہ موقع ذاتی تاثرات کے اظہار کا نہیں اس لئے میں مرزا کے انداز عیادت کی طرف لوٹتا ہوں۔ وہ جب تندرستی کو ام الخبائث اور تمام جرائم کی جڑ قرار دیتے ہیں تو مجھے رہ رہ کر اپنی خوش نصیبی پر رشک آتا ہے۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ دلیل ضرور پیش کرتے ہیں کہ جن ترقی یافتہ ممالک میں تندرستی کی وبا عام ہے وہاں جنسی جرائم کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ میں کان کے درد سے نڈھال ہونے لگا تو انہوں نے مسئلہ مسائل بیان کرکے میری ڈھارس بندھائی۔

''میاں ہمت سے کام لو۔ بڑے بڑے نبیوں پر یہ وقت پڑا ہے۔''

میں درد سے ہلکان ہوچکا تھا۔ ورنہ ہاتھ جوڑ کر عرض کرتا کہ خدا مارے یا چھوڑے میں بغیر دعویٰ نبوت یہ عذاب جھیلنے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔ علاوہ ازیں قصص الانبیاء میں نے بچپن میں پڑھی تھی اور یہ یاد نہیں آرہا تھا کہ کون سے پیغمبر کان کے درد کے باوجود فرائضِ نبوی انجام دیتے رہے۔

www.urduacademyts.com

اس واقعہ کے کچھ دن بعد میں نے ازراہِ تفنن مرزا سے کہا ''فرینک ہیرس کے زمانے میں کوئی صاحب استطاعت مرد اس وقت تک ''جنٹلمین'' ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا تھا جب تک کہ وہ کم از کم ایک مرتبہ ناگفتہ بہ جنسی امراض میں مبتلا نہ ہوا ہو۔ یہ خیال عام تھا کہ اس سے شخصیت میں لوچ اور رچاؤ پیدا ہوتا ہے۔

تمباکو کے پان کا پہلا گھونٹ پی کر کہنے لگے ''خیر یہ تو ایک اخلاقی کمزوری کی فلسفیانہ تاویل ہے مگر اس میں شبہ نہیں کہ درد اخلاق کو سنوارتا ہے۔''

وہ ٹھہرے ایک جھکی۔ اس لئے میں نے فوراً یہ اقرار کرکے اپنا پنڈ چھڑایا کہ مجھے اس کلیہ سے اتفاق ہے۔ بشرطیکہ درد شدید ہو اور کسی دوسرے کے اٹھ رہا ہو۔''

پچھلے جاڑوں کا ذکر ہے، میں گرم پانی کی بوتل سے سینک رہا تھا کہ ایک بزرگ جو اسی سال کے پیٹے میں ہیں خیر و عافیت پوچھنے آئے اور دیر تک خیر و عافیت کی باتیں کرتے رہے جو میرے تیمارداروں کو ذرا قبل از وقت معلوم ہوئیں۔ آتے ہی بہت سی دعائیں دیں جن کا خلاصہ یہ تھا کہ خدا مجھے ہزاری عمر دے تا کہ میں اپنے اور ان کے فرضی دشمنوں کی چھاتی پر روایتی مونگ دلنے کے لئے زندہ رہوں۔ اس کے بعد جانکنی اور افتاد گور کا اس قدر مفصل حال بیان کیا کہ مجھے غریب خانے پر گورِ غریباں کا گمان ہونے لگا۔ عیادت میں عبادت کا ثواب لوٹ چکے تو میری جلتی ہوئی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھا جس میں شفقت کم اور رعشہ زیادہ تھا اور اپنے بڑے بھائی کو (جن کا انتقال تین ماہ قبل اسی مرض میں ہوا تھا جس میں میں مبتلا تھا) یاد کرکے کچھ اس طرح آبدیدہ ہوئے کہ میری بھی ہچکی بندہ گئی۔ میرے لئے جو تین عدد سیب لائے تھے وہ کھا چکنے کے بعد جب انہیں کچھ قرار آیا تو مشہور تعزیتی شعر پڑھا جس میں ان غنچوں پر مسرت کا اظہار کیا گیا ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔

میں فطرتاً رقیق القلب واقع ہوا ہوں اور طبیعت میں ایسی باتوں کی سہار بالکل نہیں ہے۔ ان کے جانے کے بعد جب لاد چلے گا بنجارہ والا موڈ طاری ہوجاتا ہے اور حالت یہ ہوتی ہے کہ ہر پرچھائیں بھوت اور ہر سفید چیز فرشتہ دکھائی دیتی ہے۔ ذرا آنکھ لگتی ہے تو بے ربط خواب

www.urduacademyts.com

دیکھنے لگتا ہوں گویا کوئی ''کامک'' یا با تصویر نفسیاتی افسانہ سامنے کھلا ہوا ہے۔

کیا دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر میری لاش پر انجکشن کی پچکاریوں سے لڑ رہے ہیں اور لہولہان ہو رہے ہیں۔ ادھر کچھ مریض اپنی اپنی نرس کو کلوروفارم سنگھا رہے ہیں۔ ذرا دور ایک لاعلاج مریض اپنے ڈاکٹر کو یٰسین حفظ کرا رہا ہے۔ ہر طرف ساگودانے اور مونگ کی دال کی کھچڑی کے ڈھیر لگے ہیں۔ آسمان بنفشی ہو رہا ہے اور عناب کے درختوں کی چھاؤں میں سنا کی جھاڑیوں کی اوٹ لے کر بہت سے غلمان ایک مولوی کو غذا بالجبر کے طور پر معجونیں کھلا رہے ہیں۔ تاحد نظر کافور میں بسے ہوئے کفن ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ جابجا لوبان سلگ رہا ہے اور میرا سرسنگ مرمر کی لوح مزار کے نیچے دبا ہوا ہے اور اس کی ٹھنڈک نس نس میں گھسی جا رہی ہے۔ میرے منھ میں سگریٹ اور ڈاکٹر کے منھ میں تھرمامیٹر ہے۔ آنکھ کھلتی ہے تو کیا دیکھتا ہوں کہ سر پر برف کی تھیلی رکھی ہے، میرے منھ میں تھرمامیٹر ٹھنسا ہوا ہے اور ڈاکٹر کے ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہے۔

لگے ہاتھوں عیادت کرنے والوں کی ایک اور قسم کا تعارف کرادوں۔ یہ حضرات جدید طریق کار برتتے اور نفسیات کا ہر اصول درو پر لگا دیتے ہیں۔ ہر پانچ منٹ بعد پوچھتے ہیں کہ افاقہ ہوا یا نہیں؟ گویا مریض سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ عالم نزع میں بھی ان کی معلومات عامہ میں اضافہ کرنے کی غرض سے RUNNING COMMENTARY کرتا رہے گا۔ ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح مریض پر ثابت کردیں کہ وہ محض انتظاماً بیمار ہے یا وہم میں مبتلا ہے اور کسی سنگیں غلط فہمی کی بنا پر اسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ ان کی مثال اس روزہ خور کی سی ہے جو انتہائی نیک نیتی سے کسی روزہ دار کا روزہ لطیفوں سے بہلانا چاہتا ہو۔ مکالمہ کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

ملاقاتی : ماشاءاللہ آج منھ پر بڑی رونق ہے۔

مریض : جی ہاں آج شیو نہیں کیا ہے۔

ملاقاتی : آواز میں بھی کرارا پن ہے۔

مریض کی بیوی : ڈاکٹر نے صبح سے ساگودانہ بھی بند کردیا ہے۔

www.urduacademyts.com

ملاقاتی : (اپنی بیوی سے مخاطب ہوکر) بیگما! یہ صحت یاب ہوجائیں تو ذرا انہیں میری پتھری دکھانا جو تم نے چار سال سے اسپرٹ کی بوتل میں رکھ چھوڑی ہے۔ (مریض سے مخاطب ہوکر) صاحب یوں تو ہر مریض کو اپنی آنکھ کا تنکا بھی شہتیر معلوم ہوتا ہے۔ مگر یقین جانیے آپ کا شگاف بس دو تین انگل لمبا ہوگا میرا تو پورا ایک بالشت ہے۔ بالکل کنکھجورا معلوم ہوتا ہے۔

مریض : (کراہتے ہوئے) مگر میں تو ٹائیفائڈ میں مبتلا ہوں۔

ملاقاتی : (ایکا ایکی پینترا بدل کر) یہ سب آپ کا وہم ہے۔ آپ کو صرف ملیریا ہے۔

مریض : یہ پاس والی چارپائی جواب خالی پڑی ہے اس کا مریض بھی اسی وہم میں مبتلا تھا

ملاقاتی : ارے صاحب مانئے تو! اب آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ اٹھ کر منھ ہاتھ دھوئیے۔

مریض کی بیوی: (روہانسی ہوکر) دو دفعہ دھوچکے ہیں۔ صورت ہی ایسی ہے۔ اس وقت ایک دیرینہ کرم فرمایاد آرہے ہیں جن کا طرز عیادت ہی اور ہے۔ ایسا حلیہ بنا کر آتے ہیں کہ خود ان کی ہی عیادت فرض ہوجاتی ہے ''مزاج شریف'' کو اور رسمی فقرہ نہیں بلکہ سالانہ امتحان کا سوال سمجھتے ہیں اور سچ مچ اپنے مزاج کی جملہ تفصیلات بتانا شروع کردیتے ہیں۔ ایک دن منھ کا مزہ بدلنے کی خاطر میں نے ''مزاج شریف'' کے بجائے ''سب خیریت ہے'' سے پرسش احوال کی۔ پلٹ کر بولے ''اس جہان عزلت میں خیریت کہاں؟'' اس مابعد الطبیعاتی تمہید کے بعد کراچی کے موسم کی خرابی کا بیان، آنکھوں میں آنسو بھر ایسے انداز سے کیا گویا ان پر سراسر ذاتی ظلم ہورہا ہے اور اس کی تمام تر ذمہ داری میونسپل کارپوریشن پر عائد ہوتی ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض عورتیں شاعر کی نصیحت کے مطابق وقت کو پیمانہ امروز و فردا سے نہیں ناپتیں بلکہ تاریخ و سنہ اور واقعات کی ترتیب کا حساب اپنی اولاد زچگیوں سے لگاتی ہیں۔ مذکورالصدر دوست بھی اپنی بیماریوں سے کیلنڈر کا کام لیتے ہیں۔ مثلاً شہزادی مارگریٹ کی

www.urduacademyts.com

عمر وہ اپنے دمے کے برابر بتاتے ہیں۔ سوئز سے انگریزوں کے نہر بدر کئے جانے کی تاریخ وہی ہے جو ان کا پتا نکالے جانے کی۔ میرا قاعدہ یہ ہے کہ جب وہ اپنی اور جملہ متعلقین کی عدم خیریت کی تفصیلات بتا کر اٹھنے لگتے ہیں تو ..... اپنی خیریت سے آگاہ کر دیتا ہوں۔

بیمار پڑنے کے صدہا نقصانات ہیں مگر ایک فائدہ بھی ہے، وہ یہ کہ اس بہانے اپنے بارے میں دوسروں کی رائے معلوم ہوجاتی ہے۔ بہت سی کڑوی کسیلی باتیں جو عام طور سے ہونٹوں پر لرز کر رہ جاتی ہیں، بے شمار دل آزار فقرے جو ''خوف مناد خلق'' حلق میں اٹک کر رہ جاتے ہیں۔ اس زمانے میں یار لوگ نصیحت کی آڑ میں ''ہوالشافی'' بڑی بے تکلفی سے داغ دیتے ہیں۔ پچھلے سنیچر کی بات ہے، میرے عقل داڑھ میں شدید درد تھا کہ ایک روٹھے ہوئے عزیز جن کے مکان پر حال ہی میں قرض کے روپے سے چھت پڑی تھی لقا کبوتر کی مانند سینہ تانے آئے اور فرمانے لگے۔

'' ہیں آپ بھی ضدی آدمی۔ لاکھ سمجھایا کہ اپنا ذاتی مکان بنوالیجئے مگر آپ کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔''

طعنے کی کاٹ درد کی شدت پر غالب آئی اور میں ڈرتے ڈرتے پوچھا ''بھائی! میری عقل تو اس وقت کام نہیں کرتی۔ خدارا آپ ہی بتائیے کیا یہ تکلیف صرف کرایہ داروں کو ہوتی ہے؟''

ہنس کر فرمایا ''بھلا یہ بھی پوچھنے کی بات ہے۔ کرائے کے مکان میں تندرستی کیوں کر ٹھیک رہ سکتی ہے؟''

کچھ دن بعد جب انہی حضرت نے میرے گھٹنے کے درد کو بے دودھ کی چائے پینے اور رمی کھیلنے کا شاخسانہ قرار دیا تو بے اختیار سر پیٹنے کو جی چاہا۔

اب کچھ جگ بیتی بھی سن لیجئے۔ جھوٹ سچ کا حال خدا جانے۔ لیکن ایک دوست اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ دوماہ قبل ان کے گلے میں خراش ہوگئی جو ان کے نزدیک بدمزہ کھانے اور گھر والوں کے خیال میں سگرٹ کی زیادتی کا نتیجہ تھی۔ شروع میں انھیں اپنی بیٹھی ہوئی آواز بہت بھلی معلوم ہوئی اور کیوں نہ ہوتی۔ سنتے چلے آئے ہیں کہ بیٹھی ہوئی HUSKY آواز میں

www.urduacademyts.com

بے پناہ جنسی کشش ہوتی ہے۔ خدا کی دین ہے کہ گھر بیٹھے آواز بیٹھ گئی ورنہ امریکہ میں تو لوگ کوکا کولا کی طرح ڈالر بہاتے ہیں تب کہیں آواز میں یہ مستقل زکام کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا جب ذرا افاقہ محسوس ہوا تو انہوں نے راتوں کو گڑ گڑا گڑگڑا کر بلکہ خنخنا خنخنا کر دعائیں مانگیں :

''بارالٰہا تیری شانِ کریمی کے صدقے یہ سوزش بھلے ہی کم ہوجائے مگر بھرا ہوا گلا یونہی قائم رہے۔''

لیکن چند دن بعد جب ان کا گلا خالی بوتل کی طرح بھق بھق کرنے لگا تو انہیں بھی تشویش ہوئی۔ کسی نے کہا کہ لقمان کا قول ہے کہ ''پانی پیتے وقت ایک ہاتھ سے ناک بند کرلینے سے گلا کبھی خراب نہیں ہوتا۔''

ایک صاحب نے ارشاد فرمایا۔ سارا فتور پھل نہ کھانے کے سبب ہے۔ میں روزانہ نہار منھ پندرہ فٹ گنا کھاتا ہوں۔ معدہ اور دانت دونوں صاف رہتے ہیں۔'' اور ثبوت میں انہوں نے اپنے مصنوعی دانت دکھائے جو واقعی بہت صاف تھے۔

ایک اور خیر خواہ نے اطلاع دی کہ زکام ایک زہریلے وائرس (VIRUS) سے ہوتا ہے جو کسی دوا سے نہیں مرتا لہٰذا جو شاندہ پیجئے کہ انسان کے علاوہ کوئی جاندار اس کا ذائقہ چکھ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ بقیہ روداد انھیں کی زبانی سنئے۔

'' اور جن کرم فرماؤں نے ازراہِ کسرِ نفسی دوائیں تجویز نہیں کیں وہ حکیموں اور ڈاکٹروں کے نام اور پتے بتا کر اپنے فرائض منصبی سے سبکدوش ہوگئے۔ کسی نے اصرار کیا کہ آیورویدک علاج کراؤ۔ بڑی مشکل سے انہیں سمجھایا کہ میں طبعی موت مرنا چاہتا ہوں۔ کسی نے مشورہ دیا کہ حکیم نباضِ ملت سے رجوع کیجئے۔ نبض پر انگلی رکھتے ہی مریض کا شجرہ نسب بتا دیتے ہیں (اسی وجہ سے کراچی میں ان کی طبابت ٹھپ ہے) قارورے پر نظر ڈالتے ہی مریض کی آمدنی کا اندازہ لیتے ہیں اور زبان اگر ساتھ دیتی تو میں ضرور عرض کرتا کہ ایسے کام کے آدمی کو تو انکم ٹیکس کے محکمہ میں ہونا چاہئے۔

www.urduacademyts.com

غرض یہ کہ جتنے منھ ان سے کہیں زیادہ باتیں۔ اورتو اور سامنے کے فلیٹ میں رہنے والی اسٹینوگرافر (جو چست سوئیٹر اور جینز پہن کر بقول مرزا عبدالودود بیگ انگریزی کا S معلوم ہوتی ہے) بھی مزاج پرسی کو آئی اور کہنے لگی، حکیموں کے چکر میں نہ پڑیئے۔ آنکھ بند کرکے ڈاکٹر دلاور کے پاس جایئے۔ تین مہینے ہوئے، آواز بنانے کی خاطر میں نے املی کھا کھا کر گلے کا ناس مارلیا تھا۔ میری خوش نصیبی کہیئے کہ ایک سہیلی نے ان کا پتہ بتادیا، اب بہت افاقہ ہے۔

اس کے بیان کی تائید کچھ دن بعد مرزا عبدالودود بیگ نے بھی کی۔ انہوں نے تصدیق کی کہ ڈاکٹر صاحب امریکی طریقہ سے علاج کرتے ہیں اور ہر کسی کو بڑی توجہ سے دیکھتے ہیں چنانچہ سینڈل کے علاوہ ہر چیز اتروا کر انہوں نے اسٹینوگرافر کے حلق کا بغور معائنہ کیا۔ علاج سے واقعی کافی افاقہ ہوا اور وہ اس سلسلے میں ابھی تک پیٹھ پر بنفشی شعاعوں سے سینک کرانے جاتی ہے۔''

مجھے یقین ہے کہ اس طریقہ علاج سے ڈاکٹر موصوف کو کافی افاقہ ہوا ہوگا۔

☆☆☆

www.urduacademyts.com

قرۃ العین حیدر

قرۃ العین حیدر کے والد سید سجاد حیدر یلدرم اُردو کے مشہور ادیب اور والدہ نذر سجاد حیدر ناول و افسانہ نگار تھیں۔ وہ 20 جنوری 1920ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئیں۔ انگریزی زبان میں ایم اے کیا۔ آپ کے والد ترکی میں ملازمت کرنے گئے تو یہ بھی ساتھ تھیں۔ کئی زبانوں پر انہیں عبور حاصل تھا۔ یورپ کا سفر بھی کیا۔ انگریزی میں بھی لکھتی تھیں۔ کالج چھوڑنے کے کچھ عرصہ بعد انگریزی اخباروں میں لکھنا شروع کیا۔ اردو میں چھوٹی عمر سے پھول اور نباتات میں لکھنا شروع کیا۔ آگے چل کر ساقی، ادبِ لطیف اور سویرا میں چھپتی رہیں۔

''میرے بھی صنم خانے'' قرۃ العین کا پہلا ناول ہے۔ انہوں نے شعور کی رو کے استعمال سے اپنے ناولوں میں نیا انداز پیدا کیا۔ ''آگ کا دریا'' ان کا مشہور اور مقبول ناول ہے۔ ناول کے ساتھ متعدد افسانے ، ناولٹ، آپ بیتی تحریر کی۔ ستاروں سے آگے ، پت جھڑ کی آواز، شیشے کے گھر، روشنی کی رفتار ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں'' کارِ جہاں دراز ہے'' آپ بیتی ہے۔ ملک کے باوقار ''گیان پیٹھ ایوارڈ'' سے ان کے ادبی مرتبے کا اعتراف کیا گیا۔

ان کا مشاہدہ گہرا ہے، ان کے یہاں مغربی طرزِ فکر کے اثرات نظر آتے ہیں۔ ذہنی فضا کی پیش کشی اور کرداروں کے نفسیاتی ردِ عمل کی تصویر کشی میں انہیں بڑی مہارت حاصل ہے۔ ان کے کردار شعور کے سہارے ماضی کی بے کراں وسعتوں میں سفر کرتے ہیں۔ وہ اجتماعی شعور کی بازیافت کرتی ہیں اور ہزاروں سال کی پھیلی ہوئی زندگی ان کے چند صفحات میں سمٹ آتی ہے۔ اس کی سب سے اچھی مثال ''یہ غازی یہ ترے پر اسرار بندے'' میں ملتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کا انتقال اگست 2007ء میں دہلی میں ہوا۔

www.urduacademyts.com

یہ غازی یہ تیرے پُر اسرار بندے

قرۃ العین حیدر

ٹرین مغربی جرمنی کی سرحد میں داخل ہوچکی تھی ۔ حدّ نظر تک لالہ کے تختے لہلہا رہے تھے ۔ دیہات کی شفاف سڑکوں پر سے کاریں زنّاٹے سے گزرتی جاتی تھیں۔ ندیوں میں بطخیں تیر رہی تھیں ۔ٹرین کے ایک ڈبّے میں پانچ مسافر چپ چاپ بیٹھے تھے ۔ایک بوڑھا جو کھڑکی سے سر ٹکائے باہر دیکھ رہا تھا' ایک فربہ عورت جو شاید اس کی بیٹی تھی اور اس کی طرف سے بہت فکر مند نظر آتی تھی ۔ غالبًا وہ بیمار تھا ۔ سیٹ کے دوسرے سرے پر ایک خوش شکل طویل القامت شخص' چالیس سال کے لگ بھگ عمر متبسم پرسکون چہرہ' ایک فرنچ کتاب کے مطالعے میں منہمک تھا ۔ مقابل کی کرسی پر ایک نوجوان لڑکی جو وضع قطع سے امریکن معلوم ہوتی تھی ایک باتصویر رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی اور کبھی کبھی نظریں اٹھا کر سامنے والے پرکشش شخص کو دیکھ لیتی تھی ۔ پانچویں مسافر کا چہرہ اخبار سے چھپا ہوا تھا۔ اخبار کسی اور اجنبی زبان میں تھا ۔شاید نارویجین یا ہنگیرین یا ہوسکتا ہے آئس لینڈک ۔ اس دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو آئس لینڈک میں باتیں کرتے ہیں ۔ پڑھتے لکھتے اور شعر کہتے ہیں ۔ دنیا عجائب سے خالی نہیں ۔

امریکن نما لڑکی نے جو خالص امریکن تجسس سے یہ جاننا چاہتی تھی کہ یہ کون سی زبان ہے : اس خوبصورت آدمی کو اخبار پڑھنے والے نوجوان سے باتیں کرتے سنا ۔ وہ بھی کسی اجنبی زبان میں بول رہا تھا لیکن وہ زبان ذرا مانوس سی معلوم ہوئی ۔لڑکی نے قیاس کیا کہ یہ شخص ایرانی ترک ہے۔ وہ اپنے شہر ٹورانٹو میں ایرانی طلباء سے مل چکی تھی ۔ چلو یہ تو پتہ چل گیا کہ فیبولس گائی (Fabulous guy) پرشین ہے ۔ (اس نے انگریزی میں سوچا ۔ میں آپ کو اُردو میں بتا رہی ہوں کیوں کہ افسانہ بزبان اُردو ہے)

www.urduacademyts.com

اچانک بوڑھے نے جوانگریز تھا آہستہ سے کہا

''دنیا واقعی خاصی خوبصورت ہے''

یہ ایک قطعی برطانوی انڈر اسٹیٹمنٹ تھا۔لڑکی کو معلوم تھا کہ دنیا حد سے زیادہ خوبصورت ہے۔

بوڑھے کی بیٹی کینیڈین لڑکی کو دیکھ کر خفیف سی اداسی سے مسکرائی' باپ کی ٹانگوں پر کمبل پھیلا کر مادرانہ شفقت سے کہا۔''ڈیڈ! اب آرام کرو۔''

اس نے جواب دیا۔''انڈیا! میں یہ مناظر دیکھنا چاہتا ہوں۔''

اس کے بعد بیٹی نے رسان سے کہا۔''اچھا۔اس کے بعد ذرا سوجاؤ''

اس کے بعد وہ آکر کینیڈین لڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔گوانگریز تھی مگر شاید اپنا دکھ بانٹنا چاہتی تھی۔

''میرا نام ایڈناہنٹ ہے۔یہ میرے والد ہیں پروفیسر چارلس ہنٹ۔''

اس نے آہستہ سے کہا۔

''تمارا فیلڈنگ۔ٹورانٹو۔کینڈا''

''کیمبرج' انگلینڈ' ڈیڈوہاں پیٹر ہاؤس میں ریاضی پڑھاتے تھے''

''سرطان۔اورانھیں بتا دیا گیا ہے۔''ایڈنا نے سرگوشی میں جواب دیا

''اوہ۔آئی ایم سوسوری۔''تمارافیلڈنگ نے کہا۔خاموشی چھاگئی۔کسی اجنبی کے ذاتی الم میں دفعتاً داخل ہوجانے سے بڑی خجالت ہوتی ہے۔

''اگرکسی کو یہ معلوم ہوجائے۔''ایڈنا نے آہستہ سے کہا۔''کہ یہ دنیا بہت جلد فلاں مدت کے بعد اور ہمیشہ کے لئے چھوڑنی ہے تو جانے کیسا لگتا ہوگا۔''

''اس معاملے میں انسان کو بہت صابر اور فلسفی ہوجانا چاہئے''تمارا نے کہا اور خفیف سی ہنسی۔

''حالانکہ یہ بھی بیکار ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔جیسے میں اس وقت خود صابر اور فلسفی بننے کی کوشش کررہی ہوں۔''

تمارا نے کہا۔

www.urduacademyts.com

ایڈنا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا ۔ گو بحیثیت ایک وضعدار انگریز خاتون وہ کسی سے ذاتی سوال کرنا نہ چاہتی تھی ۔

اس بے تکلف کینیڈین لڑکی نے بات جاری رکھی ۔'' میں جرمنی آنا چاہتی تھی ۔ اس ملک سے بہت خوفناک یادیں وابستہ ہیں ۔ میری والدہ کے دو ماموں' ایک خالہ' ان کے بچے سب کے سب ۔ میری ممی آج بھی کسی فیکٹری کی چمنی سے دھواں نکلتا دیکھتی ہیں تو منہ پھیرلتی ہیں''

'' اوہ''

'' حالانکہ یہ میری پیدائش سے بہت پہلے کے واقعات ہیں ۔''

'' اوہ ۔ میں تمھارے کرسچین نام سے سمجھی تم روسی نژاد ہو۔حالانکہ تمہارا خاندانی نام خالص اینگلوسیکسن ہے۔''

''میرے نانا روسی تھے ۔میرے والد کا اصل نام ڈیوڈ گرین برگ تھا۔ کینیڈا جاکر تعصب سے بچنے کے لئے بدل کر فیلڈنگ کرلیا لیکن میں ۔''اس نے ذرا جوش سے کہا'' میں اپنے باپ کی طرح بزدل نہیں۔ میں اپنا پورا نام اس طرح لکھتی ہوں۔ تمارا گرین برگ فیلڈنگ''

''واقعی۔'' برطانوی خاتون نے کہا''کتنی دلچسپ بات ہے۔''

''اولاد آدم کا شجرہ بہت گنجلک ہے۔'' تمارا نے غیر ارادی طور پر ذرا اونچی آواز میں کہا کیوں کہ وہ اس وجہ سے ہمیشہ متحیر رہتی تھی۔

سامنے والے دلکش آدمی نے اس کا فقرہ سنا اور سر اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرایا۔ گویا کہتا ہو۔''میں تمہاری بات سمجھتا ہوں۔'' لڑکی دل ہی دل میں اس کی مشکور ہوئی اور اسے دیکھ کر خود مسکرائی۔ اب غالبًا میں اس اجنبی پر عاشق ہوتی جارہی ہوں۔

برطانوی خاتون نے بھی اندازہ لگایا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو دلچسپی سے دیکھ رہے ہیں۔ ایک جگہ پر دو انسان ایک دوسرے کی طرف کھینچیں تو سمجھ لیجئے کہ اس انڈر کرنٹ کو حاضرین فوراً محسوس کرلیں گے کیوں کہ اولاد آدم کی باہم کشش کا عجب گھپلا ہے۔

www.urduacademyts.com

بوڑھا پروفیسر آنکھیں کھول کر پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔

''میرے نانا..... جب کریمیا سے بھاگے انقلاب کے وقت تو اپنے ساتھ صرف قرآن لے کر بھاگے تھے۔'' تمارا نے آہستہ سے کہا

''کوران۔؟'' ایڈنا نے تعجب سے دہرایا۔

''ہاں۔وہ موزلم تھے اور میری نانی ،ممی کو بتاتی تھی،وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ قرآن میں لکھا ہے، دنیاواقعی بہت خوبصورت ہے۔ اس میں خوشی سے رہو اور دوسروں کو بھی خوش رہنے دو'اور شاید موزلم پروفٹ نے کہا تھا کہ اس سے بہتر دنیا نہیں ہوسکتی۔'' سگریٹ سلگانے کے لئے تمارا نے حسب معمول لائٹر کی تلاش میں بیگ کھنگالنا شروع کیا۔ایرانی نما شخص نے فوراً آگے جھک کر اپنا لائٹر جلایا۔ پھر اجازت چاہ کر تمارا کے پاس بیٹھ گیا۔

ایڈناہنٹ دوسری طرف سرک گئی ،ایرانی نما شخص کھڑکی کے باہر گزرتے ہوئے سہانے منظر دیکھنے میں محو ہوگیا۔ تمارا نے اس سے آہستہ سے کہا۔'' یہ بزرگ سرطان میں مبتلا ہیں۔ جن لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ چند روز بعد دنیا سے جانے والے ہیں انھیں جانے کیسا لگتا ہوگا۔ یہ خیال کہ ہم بہت جلد معدوم ہو جائیں گے۔ یہ دنیا پھر کبھی نظر نہ آئے گی۔''

ایرانی نما شخص درد مندی سے مسکرایا۔''جس انسان کو یہ معلوم ہو کہ وہ عنقریب موت کے منھ میں جانے والا ہے ،وہ سخت دل ہو جاتا ہے۔''

''واقعی''۔

ہم سفر نے اپنا نام بتایا۔ دکتور شریفیان، بتریز یونیورسٹی ،شعبہ تاریخ کارڈ دیا۔ اس پر نام کے بہت سے نیلے حروف چھپے تھے۔لڑکی نے بشاشت سے دریافت کیا۔'' این آئی کیو۔ یعنی نوآئی۔کیو؟''

''نصرت الدین امام قلی''

لڑکی نے اپنا نام بتانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ اس نصرت الدین امام قلی

www.urduacademyts.com

سے اس کی پہلی اور آخری ملاقات ہرگز نہیں ہے۔

ایک قصبے کے اسٹیشن پر ٹرین رکی۔اخبار پڑھنے والالڑکا اسی جگہ سرعت سے اتر گیا۔دکتور شریفیان بھی لپک کر باہر گئے۔ بارش شروع ہوچکی تھی۔ درخت ، پھول اور گھاس پانی سے جگمگا رہے تھے۔اکادکا مسافر برساتیاں اوڑھے پلیٹ فارم پر چپ چاپ کھڑے تھے۔ چند لمحے بعد ایرانی پروفیسر لمبے ڈگ بھرتا کمپارٹمنٹ میں واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں لالہ کے دو گلدستے تھے جو اس نے بڑے اخلاق سے جھک کر دونوں خواتین کو پیش کئے اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

آدھ گھنٹہ گزرا گیا۔ بوڑھا سو چکا تھا۔ دوسرے کونے میں اس کی فربہ بیٹی اپنی بانہوں پر سر رکھ کر اونگھ رہی تھی۔ دفعتاً ایرانی دکتور نے کنیڈین لڑکی سے کہا۔''تمارا خانم کہاں تک میرے ساتھ رہوگی؟''

وہ اس سوال کا مطلب سمجھی اسے آج تک تمارا خانم کہہ کر مخاطب نہ کیا گیا تھا۔ دراصل وہ اپنے گھر اور کالج میں ٹم کہلاتی تھی۔ کہاں نامعقول ٹم! اور کہاں تمارا خانم۔جیسے سرود بج رہا ہو یا عمر خیام کا مصرع۔تمارا خانم کی ایران سے واقفیت محض ایڈورڈ فٹز جیرلڈ تک محدود تھی۔ اس نے اسی کیفیت میں کہا۔'' جہاں تک ممکن ہو۔''

بہر حال وہ دونوں ایک ہی جگہ جا رہے تھے۔تمارا نے ایرانی پروفیسر کے سوٹ کیس پر چپکا لیبل پڑھ لیا تھا۔

''تم وہاں پڑھنے جا رہی ہو یا سیر کرنے؟''

''پڑھنے۔بایوکمیسٹری ۔مجھے ایک اسکالر شپ ملا ہے۔تم ظاہر ہے پڑھانے جارہے ہوگے۔''

''صرف چند روز کے لئے۔ میری دانش گاہ نے ایک ضروری کام سے بھیجا ہے۔''ٹرین قرونِ وسطی کے ایک خوابیدہ یونیورسٹی ٹاؤن میں داخل ہوئی۔

دوسرا روز وعدے کے مطابق ایک کیفے ٹیریا میں ملے۔ کاونٹر سے کھانا لینے کے بعد ایک

www.urduacademyts.com

دریچے والی میز پر جا بیٹھے۔دریچے کے عین نیچے خوش منظر ندی بہہ رہی تھی۔ دوسرے کنارے پر ایک کائی آلود گوتھک گرجا گھر کھڑا تھا۔ سیاہ گاؤن پہنے انڈر گریجویٹ ندی کے پل پر سے گزر رہے تھے۔

''بڑا خوبصورت شہر ہے۔'' تمارا نے بے ساختہ کیا۔ حالانکہ وہ جرمنی کی کسی چیز کی تعریف کرنا نہ چاہتی تھی۔

دکتور نصرت الدین ایک پر مذاق اور خوش دل شخص تھا۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اسے ہنسا تا رہا۔ تمارا نے اسے بتانے کی ضرورت نہ سمجھی کہ وہ جرمنی سے کیوں متنفر تھی۔

اچانک نصرت الدین نے خالص طہرانی لہجے میں اس سے کہا۔

''خانم جون''

''ہوں؟ جون کا مطلب؟''

''زندگی؟''

''ونڈرفل یعنی میں تمہاری زندگی ہوں!''

اس نے بے پروائی سے ہاتھ ہلایا۔'' ہاہا۔ میری زندگی! سنو خانم جون۔

ایک دلچسپ بات بتاؤں۔تم مجھے بالکل میری دادی جیسی لگتی ہو؟''

''بہت خوب۔آپ سے زیادہ با اخلاق شخص پورے یورپ میں نہ ہوگا۔

ایک چوبیس سالہ لڑکی کو آپ دادی بنائے دے رہے ہیں۔''

''واللہ کسی روز تمہیں ان کی تصویر دکھاؤں گا۔''

دوسری شام وہ اس کے ہوسٹل کے کمرے میں آیا۔ تمارا اب تک اپنا سوٹ کیس بند کر کے سامان ترتیب سے نہیں جما سکی تھی۔ سارے کمرے میں چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔

''بہت پھوہڑ لڑکی ہو۔کوئی سمجھ دار آدمی تم سے شادی نہ کرے گا۔'' اس نے آتش دان کے سامنے چمڑے کی آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے کہا۔

www.urduacademyts.com

تمارا نے جلدی جلدی کچھ سامان اٹھا کر ایک طرف رکھا۔

''لوگ باگ مجھ سے ابھی سے جلنے لگے ہیں کہ میں نے آتے ہی کیمپس کی سب سے خوبصورت لڑکی چھانٹ لی۔''

''چھانٹ لی! عرب شیوخ کی طرح آپ بھی حرم رکھتے ہیں!'' تمارا نے مصنوعی غصے سے کہا۔

وہ زور سے ہنسا اور کرسی کی پشت پر سر ٹکا دیا۔ دریچے کے باہر صنوبر کے پتے سرسرائے۔

''وہ بھی عجیب عیاش، بزدل ظالم قوم ہے۔'' تمارا نے مزید اظہارِ خیال کیا اور ایک الماری کا پٹ زور سے بند کر دیا۔ الماری کے قد آدم آئینے میں پروفیسر کا دلنواز پروفائل نظر آیا اور اس پر مزید عاشق ہوئی۔

''تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ خانم جون ہم ایرانیوں کی بھی عربوں سے کبھی نہیں پٹی۔ ہم تو انھیں کاکروچ کھانے والا کہتے ہیں۔''نصرت نے مسکرا کر پائپ جلایا۔

''کاکروچ کھاتے ہیں؟'' تمارا نے حیرت سے پوچھا اور منھ بنایا۔ وحشی، بدو، مشرقی، معاف کرنا میرا مطلب ہے۔تم تو ان سے بہت مختلف ہو۔ ایرانی تو مڈل ایسٹ کے فرنچ مین کہلاتے ہیں۔'' اس نے ذرا خجالت سے اضافہ کیا۔

''درستِ متشکرم! متشکرم!''

''ترجمہ کرو۔''

''جی تھینکس'' اس نے ناک میں بولنے والے امریکن لہجے میں کہا۔

وہ خوب کھلکھلا کر ہنسی۔''تم بہت اچھے اداکار ہو۔ کم سے کم ٹی۔وی اسٹار تو بن سکتے ہو۔''

''واقعی؟ بہت جلد تم مجھے ٹی۔وی۔اسکرین پر دیکھ لوگی۔''

''کیا تم نے کبھی ایکٹنگ کی ہے؟''

''بہت۔ کالج میں ہمیشہ رومیو یہ خاکسار ہی بنا کرتا تھا اور فرہاد''

www.urduacademyts.com

''فرہاد کون؟''

''تھے ایک صاحب ۔آغا فرہاد بیگ۔'' اس نے نظامی کے چند اشعار پڑھے۔ ان کا ترجمہ کیا۔ پھر پروفیسروں والے انداز میں جیسے کلاس کو پڑھاتا ہو' اس راستے کا نقشہ سمجھایا جدھر سے آرمینیا کی شہزادی شریں اس کے اپنے وطن آذربائیجان سے گزرتی ہوئی خسرو کے دارالسلطنت پہنچی تھی۔ بعدازاں کوہِ بے ستون کا جغرافیہ اس کینیڈین دانش جو کو ذہن نشیں کرایا۔

ہفتے کی شام کو وہ پہلی بار دکتور شریفیان کی قیام گاہ پر اس کے ہمراہ گئی کیمپس سے خاصی دور صنوبروں کے جھرمٹ میں چھپی ایک پرانی عمارت کی دوسری منزل پر اس کا دو کمروں کا اپارٹمنٹ تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر نصیر الدین نے لیمپ جلایا۔ تمارا نے کوٹ اتار کر کرسی پر رکھتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ فارسی کتابیں اور رسالے سارے میں بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے تھے۔

تمارا کو معلوم تھا اب وہ ہزاروں بار دہرایا ہوا ڈراما دہرایا جائے گا۔ وہ ریڈیو گرام پر ریکارڈ لگائے گا۔ پھر اس سے پوچھے گا اسے کونسی شراب پسند ہے۔ عین اس وقت سارے مغرب کے ان گنت کمروں میں یہی ڈراما کھیلا جا رہا ہوگا اور وہ اس ڈرامے میں اس آدمی کے ساتھ حصہ لیتے ہوئے ناخوش نہ تھی۔

نصرت نے قیمتی فرانسیسی شراب اور دو گلاس سائڈ بورڈ سے نکالے اور صوفے کی طرف آیا۔ پھر اس نے جھک کر کہا۔ ''تمارا خانم اب وقت آ گیا ہے کہ تم کو اپنی دادی سے ملواؤں۔''

وہ سرخ ہو گئی ''معلوم ہے ہمارے یہاں مغرب میں اس جملے کے کیا معنی ہوتے ہیں؟''

''معلوم ہے'' اس نے ذرا بے پروائی سے کہا۔ لیکن اس کے لہجے کی خفیف سی بے پروائی کو تمارا نے شدت سے محسوس کیا۔ اب نصرت الدین نے الماری میں سے ایک چھوٹا سا البم نکالا اور ایک ورق الٹ کر اسے پیش کیا۔

ایک بے حد حسین لڑکی پچھلی صدی کے خاور میانہ کی پوشاک میں ملبوس ایک فرنچ وضع کی کرسی پر بیٹھی تھی۔ پس منظر میں سنگترے کے درخت تھے۔

www.urduacademyts.com

''دادی اماں۔ اور یہ۔ ہمارا سنگتروں کا باغ تھا''

تمارا نے دیکھا دادی میں اس سے بہت ہلکی سی مشابہت ضرور موجود تھی۔ اس نے دوسرا صفحہ پلٹنا چاہا۔ نصرت الدین نے فوراً بڑی ملائمت سے البم اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

''تمارا خانم وقت ضایع نہ کرو۔ وقت بہت کم ہے''

تمارا نے سینڈل اتار کر پاؤں صوفے پر رکھ لئے ۔وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے پاؤں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔'' اتنے نازک چھوٹے پیر۔تم ضرور کسی شاہی خاندان سے ہو۔''

''ہوں تو سہی شاید۔''

''کون سا؟ ہر میجسٹی اعلیٰ حضرت تمہارے والد یا چچا دادا اس وقت سوئٹزر لینڈ کے کون سے قصبے میں پناہ گزین ہیں؟''

''میرے والد ٹورانٹو میں ایک گارمنٹ فیکٹری کے مالک ہیں۔ تمارا نے نہیں دیکھا کہ ایک ہلکا سایہ دکتور شریفیان کے چہرے پر سے گزر گیا۔'' لیکن میرے نانا غالبًا خواتین کریمیا کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔''

''اوہو۔ خواتین کریمیا!..... حاجی سلیم گرائی۔ قرادولت گرائی۔ جانی بیگ گرائی محمود گرائی۔کون سے گرائی؟''

''نصرت مجھے معلوم ہے تم تاریخ کے استاد ہو۔رعب مت جھاڑو۔ مجھے پتہ نہیں کون سے گرائی۔میں نے تو یہ نام اس وقت تم سے سنے ہیں۔''

''اور موصوف تمہارے نانا بابشویک انقلاب سے بھاگ کر پیرس آئے۔''

''ہاں ،وہی پرانی کہانی۔ پیرس آئے اور ایک ریستوران میں نوکر ہوگئے اور ریستوران کے مالک کی خوبصورت لڑکی رزولین سے شادی کرلی اور رزولین کے ابّا بہت خفا ہوئے کیوں کہ ان کی دوسری لڑکیوں نے یہاں جرمنی میں اپنے ہم مذہبوں سے بیاہ کئے تھے۔'' وہ دفعتاً چپ ہوگئی۔اب اس کے چہرے پر سے ایک ہلکا سایہ گزرا جسے نصرت الدین امام قلی نے نہیں دیکھا۔

www.urduacademyts.com

چند لمحوں بعد تمارا نے پھر کہنا شروع کیا۔''رزولین کے والد واقعی بہت خفا تھے۔ جب رزولین ان سے فخریہ کہتیں کہ انھوں نے ایک روسی شہزادے سے شادی کی ہے تو وہ گرج کر جواب دیتے۔ آج کل ہر چپڑقناتی کوچوان،سائیس ،خاکروب، جو روس سے بھاگ کر یہاں آرہا ہے، اپنے آپ کو ڈیوک اور کاؤنٹ سے کم نہیں بتاتا۔تمہارا تاتاری خاوند بھی کریمیا کے کسی خان کا چوبدار رہا ہوگا ،نانا بچارے کا تین سال بعد ہی انتقال ہوگیا۔ دراصل شاید جلاوطنی کا الم انہیں کھا گیا۔'' اب شریفیان کے چہرے پر سے ایک اور سایہ گزرا جیسے تمارا نے نہیں دیکھا۔'' میری ممی ان کی اکلوتی اولاد تھیں۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں ممی نے ایک پولش ریفیوجی سے شادی کرلی۔ وہ دونوں آزاد فرانسیسی فوج میں اکٹھے لڑے تھے۔ جنگ کے بعد وہ فرانس سے ہجرت کرکے امریکہ آگئے ۔جب میں پیدا ہوئی تو ممی نے میرا نام اپنی ایک نادیدہ مرحومہ پھوپھی کے نام پر تمارا رکھا۔ وہ پھوپھی روسی خانہ جنگی میں ماری گئیں ۔ہمارے خاندان میں نصرت الدین ایسا لگتا ہے کہ ہر نسل نے دونوں طرف سوائے خوفناک قسم کے اموات کے کچھ نہیں دیکھا۔''

''ہاں بعض خاندان اور بعض نسلیں ایسی بھی ہوتی ہیں۔''.....نصرت الدین نے آہستہ سے پوچھا۔''فی الحال تمہاری قومیت کیا ہے؟''

''کینیڈین''

ایرانی پروفیسر نے شراب گلاسوں میں انڈیلی اور مسکرا کر کہا۔''تمہارے نانا اور میری دادی کے نام ۔'' انھوں نے گلاس ٹکرائے۔

دوسرا ہفتہ.....سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ایک ریستوران کی طرف جاتے ہوئے بازار میں سے گزرے۔ اچانک وہ کھلونوں کی ایک دکان کے سامنے ٹھٹک گیا اور کھڑکیوں میں سجی گڑیوں کو بڑے پیار سے دیکھنے لگا۔

''تمہارے بہت سارے بھانجے بھتیجے ہیں نصرت الدین؟'' تمارا نے دریافت کیا۔

www.urduacademyts.com

وہ اس کی طرف مڑا اور سادگی سے کہا۔'' میرے پانچ عدد بچے اور ایک عدد ان کی ماں میری محبوب بیوی ہے۔ میری سب سے بڑی لڑکی اٹھارہ سال کی ہے۔ اس کی شادی ہونے والی ہے اور اس کا منگیتر میرے بڑے بھائی کا لڑکا ۔ وہ دراصل ٹسٹ پائلٹ ہے۔ بڑی خطرناک زندگی ہے اس بیچارے کی ۔''وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

اس وقت تمارا کو معلوم ہوا کہ جب کسی پر فالج گرتا ہو تو کیسا لگتا ہوگا۔

اس نے آہستہ سے خوددار آواز میں جس سے ظاہر نہ ہو کہ شاکی ہے۔ کہا ''تم نے کبھی بتایا نہیں۔''

'' تم نے کبھی پوچھا نہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اچانک تمارا نے اسے پہلی بار دیکھا۔ وہ ایک سنکی انسان تھا۔ کوہِ بے ستون کے پتھروں سے تراشا ہوا مجسمہ۔

ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ تمارا اس سے اسی طرح ملا کی۔وہ اسے مغرب کی Permis Sive سوسائٹی کی ایک آوارہ لڑکی سمجھتا ہے تو سمجھا کرے۔ وہ تو اس پر سچے دل سے عاشق تھی۔ اس پر جان دیتی تھی۔

ایک رات ندی کے کنارے بنچ پر بیٹھے ہوئے نصرت نے تمارا سے کہا

''ہلو خواند خاتون۔''

''کون؟''

''علاالدین کیقبا ددوم کی ملکہ۔''

کبھی وہ اسے ترکان خاتون کہہ کہ پکارتا۔ ملک شاہ سلجوتی کی بیگم کبھی اسے ساقی بیگ کہتا۔'' کیوں کہ تمہارے اندر کم از کم پندرہ فیصد تاتاری خون تو ہے ہی، اور سنو۔فرض کرو۔'' ندی کے کنارے اس رات اس نے کہا ''اگر تمہارے نانا کریمیا ہی میں رہ گئے ہوتے وہیں کسی خانزادی سے شادی کر لی ہوتی اور تمہاری اماں فرض کرو ہمارے کسی اوغلو پاشا سے بیاہ کر تبریز آجاتیں تو تم میری گل چہر خانم ہوسکتی تھی۔''

www.urduacademyts.com

دفعتاً وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تاریخ ،نسل ،خون ،کس کا کیا قصور ہے؟ وہ بہت بے رحم تھا۔

نصرت الدین اس کے رونے سے مطلق نہ گھبرایا۔ نرمی سے کہا۔ ''چلو بی بی جون گھر چلیں۔''

''گھر؟'' اس نے سر اٹھا کر کہا۔''میرا گھر کہاں ہے؟''

''تمہارا گھر ٹورانٹو میں ہے۔تم نے کبھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ میرا گھر کہاں ہے؟'' نصرت الدین نے ذرا تلخی سے کہا۔ وہ روتی رہی لیکن اچانک دل میں امید کی مدھم سی شمع روشن ہوئی ۔یہ ضرور اپنی بیوی سے ناخوش ہے۔ اس کی ازدواجی زندگی پرسکون نہیں۔ اسی وجہ سے کہہ رہا ہے۔''میرا گھر کہاں ہے؟''

ان تمام مغربی لڑکیوں کی طرح جو مشرقی نوجوانوں سے معاشقے کے دوران ان کی زبان سیکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ تمارا بڑے اشتیاق سے فارسی کے چند فقرے یاد کرنے میں مصروف تھی۔ ایک روز کیفے ٹیریا میں اس نے کہا۔''آغا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ جب ہم بوڑھے ہو جائیں تب ملیں۔''

''ہاں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔''

''آج سے بیس سال بعد جب تم مورخوں کی کسی کانفرنس کی صدارت کے لئے مونٹریال آؤ یا یو۔این ۔او میں ایرانی سفیر ہو کر نیویارک پہنچو۔''

''اور تم کسی امریکن کروڑ پتی کی فربہ بیوہ ہو۔''

''ہاں ۔ اور ٹفنی میں ہماری اچانک مڈبھیڑ ہو جائے۔ جہاں تم اپنی نواسی کی منگنی کی انگوٹھی خرید نے آئے ہو۔ اور تم سوچو میں نے اس بوڑھی موٹی عورت کو پہلے کہیں دیکھا ہے ۔فارسی میں بوڑھی عورت کو کیا کہتے ہیں؟''

''پیرہ زن۔''

www.urduacademyts.com

''اور عربی میں؟''

''مجھے عربی نہیں آتی۔ ترکی اور فرنچ میں البتہ بتا سکتا ہوں۔''

''سنو نصرت الدین۔ ایک بات سنو۔ آج صبح میں نے ایک عجیب خوفناک وعدہ اپنے آپ سے کیا ہے''

''کیا؟''

''جب میں اس امریکن کروڑ پتی سے شادی کروں گی؟''

''جو بوجہ السر تمہیں جلد بیوہ کر جائے گا۔''

''ہاں۔ لیکن اس سے قبل ایک بار۔ صرف ایک بار۔ تم جہاں کہیں بھی ہوگے۔ تبریز، اصفہان، شیراز۔ میں وہاں پہنچ کر اپنے اس نامعقول شوہر کے ساتھ ضرور بے وفائی کروں گی۔ ضرور باالضرور۔''

نصرت نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔''بعض دفعہ تم مجھے اپنی دادی کی تصویر معلوم ہوتی ہو۔ بعض دفعہ میری لڑکی کی۔ وہ بھی تمہاری طرح اپنے ابنِ عم کو اس شدت سے چاہتی ہے۔'' وہ پھر ملول نظر آیا۔

''آغا۔ تم مجھے بھی اپنی بنتِ عم سمجھو۔''

''تم میری بنت عم ہو تو سہی۔''

''کیوں کہ ہم سب اولاد آدم ہیں۔ ہے نا؟

''اولاد آدم ،اولاد ابراہیم ،آل یافث ،آل اسحٰق، آل اسمٰعیل ، میں انسان کے شجرۂ نسب کے اس گھپلے پر مزید روشنی ڈال سکتا تھا تمارا خانم لیکن اب کھانا شروع کرو۔''

وہ ریستوران کی دیوار پر لگے ہوئے آئینے میں اس کا پروفائل دیکھنے لگی اور بولی'' میں نے آج تک ایسی خوبصورت ناک نہیں دیکھی۔''

''میں نے بھی نہیں دیکھی۔'' شریفیان نے کہا

www.urduacademyts.com

''آغا۔تم میں نرگیسیت بھی ہے؟'' تمارا نے پوچھا۔

''ہے۔'' وہ شرارت سے مسکرایا۔

اس وقت اچانک تمارا کو ایک قدیم فرانسیسی دعا یاد آئی جو برٹینی کے ماہی گیر سمندر میں اپنی کشتی لے جانے سے پہلے پڑھتے تھے۔

اے ربِ عظیم۔ میری حفاظت کرنا

میری ناؤ اتنی چھوٹی سی ہے

اور تیرا سمندر اتنا بڑا ہے

اس نے دل میں دُہرایا

اے ربِ عظیم ۔اس کی حفاظت کرنا

اس کی ناؤ اتنی چھوٹی سی ہے

اور تیرا سمندر

''آغا ۔ایک بات بتاؤ۔

''ہوں۔''

''تم نے آج کا اخبار پڑھا؟ تمہارے ملک کے بہت دانش ور جو دانش ور شہنشاہ کے خلاف ہیں انھوں نے برلن میں کل بڑا بھاری جلوس نکالا۔''

''پڑھا۔''

''تم تو جلاوطن ایرانی نہیں ہو؟''

''نہیں۔ میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تمارا خانم میں لڑکے پڑھاتا ہوں؟''

''اچھا شکر ہے۔ دیکھو کسی خطرے میں نہ پڑنا۔ ہر طرف آج کل دنیا میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ اپنا خیال رکھو۔''

''اچھا۔''

www.urduacademyts.com

اس رات وہ حسبِ معمول ندی کے کنارے بیٹھے تھے۔ تمارا نے کہا۔

''جب ہم اپنے اپنے دیس واپس جائیں گے میں کتنی باتیں یاد کروں گی۔ تم کو خیر کبھی میرا خیال بھی نہ آئے گا۔ تم مشرقی لوگوں کی عادت ہے یورپ امریکہ آ کر لڑکیوں کے ساتھ تفریح کی اور واپس چلے گئے۔ بتاؤ کبھی میرا خیال آئے گا؟''

وہ مسکرا کر چپ چاپ پائپ پیتا رہا۔

''تم نصرت الدین امام قلی میرا دل رکھنے کے لئے اتنا بھی نہیں کہہ سکتے کہ کم از کم سال کے سال ایک عدد نیو ایرز کارڈ ہی بھیج دیا کرو گے۔ اب تک میرا پتہ بھی نوٹ بک میں نہیں لکھا۔ اس نے نصرت کے کوٹ کی جیب سے نوٹ بک نکالی۔ اس کا صفحہ پلٹ کر اپنا نام اور پتہ لکھا اور بولی۔ ''وعدہ کرو۔ یہاں سے جا کر مجھے خط لکھو گے۔''

''میں غلط وعدے کبھی نہیں کرتا۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ذرا خفگی سے آگے آگے چلنے لگی۔ نصرت نے چپکے سے جیب میں سے نوٹ بک نکالی۔ وہ صفحہ علیحدہ کیا جس پر تمارا نے اپنا پتہ لکھا تھا۔ باریک باریک پرزے کر کے ان کی گولی بنائی اور ندی میں پھینک دی۔

صبح سویرے چھ بجے تمارا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے تکیے سے ذرا سر اٹھا کر دریچے کے باہر دیکھا۔ صبح کی روشنی نقرئی پانی کی مانند صنوبروں پر پھیل رہی تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے آنکھیں بند کیں اور پھر سو گئی۔

سوا آٹھ کے قریب جب وہ بستر سے اٹھی نصرت میز پر ناشتہ چننے میں مصروف ہو چکا تھا۔

فون کی گھنٹی بجی۔ تمارا نے کروٹ بدل کر کاہلی سے ہاتھ بڑھایا۔ ٹیلفیون پلنگ کے سہارے کتابوں کے انبار پر رکھا تھا۔ اس نے ذرا سا سرک کر رسیور اٹھایا اور ''اُلو'' کہے بغیر نصرت کو اشارے سے بلایا۔

وہ لپک کر آیا اور رسیور ہاتھ میں لے کر کسی سے فرنچ میں باتیں کرنے لگا۔ گفتگو ختم کرنے

www.urduacademyts.com

کے بعد نصرت نے جھک کر اس سے کہا ''خانم جون۔ اب اٹھو''

اس نے سستی سے کلاک پر نظر ڈالی اور منٹ کی سوئی کو آہستہ آہستہ پھسلتے دیکھتی رہی۔ نصرت باورچی خانے میں گیا۔ قہوے کی کشتی لا کر گول میز پر رکھی۔ تمارا کو پھر آواز دی اور دریچے کے قریب کھڑے ہو کر قہوہ پینے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں توس تھا اور دوسرے میں پیالی اور وہ ذرا جلدی جلدی توس کھاتا جا رہا تھا۔ سفید جالی کے پردے کے مقابل اس کے پروفائل نے بے حد غضب ڈھایا تمارا چھلانگ لگا کر پلنگ سے اتری اور اس کے قریب جا کر بڑے لاڈ سے کہا۔ ''آج اتنی جلدی کیا ہے۔ تم تو ہمیشہ دیر سے کام پر جاتے ہو۔''

''ساڑھے نو بجے وائس چانسلر سے اپوائنٹ منٹ ہے۔ اس نے کلاک پر نظر ڈال کر جواب دیا۔'' جھٹ پٹ تیار ہو ناشتہ کرلو۔ تمہیں راستہ میں اتارتا جاؤں گا۔''

ٹھیک نو بجے پروہ دونوں عمارت کے باہر نکلے۔ صنوبروں کے جھنڈ میں سے گزرتے سڑک کی طرف روانہ ہو گئے۔ رات بارش ہوئی تھی اور بڑی سہانی ہوا چل رہی تھی۔ گھاس میں کھلے زرد پھول کی وسعت میں لہریں سی اٹھ رہی تھیں۔

وہ دس منٹ تک سڑک کے کنارے ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے رہے۔ اتنے میں ایک بس آتی نظر آئی۔ نصرت نے آنکھیں چندھیا کر اس کا نمبر پڑھا اور تمارا سے بولا۔ ''یہ تمہارے ہوسٹل کی طرف نہیں جاتی۔ تم دوسری بس میں چلی جانا۔ میں اسے پکڑتا ہوں۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر بس روکی۔ تمارا کی طرف پلٹ کر کہا'' خدا حافظ'' اور لپک کر بس میں سوار ہو گیا۔

شام کو کلاس سے واپس آ کر تمارا نے حسب معمول اُسے فون کیا۔ گھنٹی بجی۔ وہ شاید اب تک واپس نہ آیا تھا۔

دوسری صبح اتوار تھا۔ وہ کافی دیر میں سو کر اٹھی ۔ اس کی جرمن روم میٹ باہر جا چکی تھی۔ اس نے اٹھ کر حسب معمول دروازے کے نیچے پڑے ہوئے سنڈے اڈیشن اٹھائے۔ سب سے

www.urduacademyts.com

اوپر والے اخبار کی شہ سرخی میں وہ خوفناک خبر چھپی تھی۔ اس کی تصویر بھی شایع ہوئی تھی۔ وہ دکتور نصرت الدین امام قلی شریفیان پروفیسر تاریخ دانش گاہ تبریز نہیں تھا۔ ایرانی بھی نہیں تھا لیکن اخبار میں اس کا جو نام چھپا تھا وہ بھی غالبًا اس کا اصل نام نہ تھا۔ اس کے ساتھ دوسری تصویر اس دبلے پتلے نوجوان کی تھی جو ٹرین میں سارا وقت اخبار پڑھتا رہا تھا اور خاموشی سے ایک قصبے کے اسٹیشن پر اتر گیا تھا۔

نزدیک کے ایک شہر کے ایئر پورٹ میں ایک طیارے پر دستی بموں اور مشین گنوں سے حملہ کرتے ہوئے وہ تین مارے گئے تھے۔ نصرت الدین نے حملہ کرنے کے بعد سب سے پہلے دستی بم سے خود کو ہلاک کیا تھا۔ اپنی خوشی اپنی مرضی سے ہمیشہ کے لئے معدوم ہوگیا تھا۔

وہ دن بھر نیم غشی کے عالم میں پڑی رہی۔ متواتر اور مسلسل اس کے دماغ میں طرح طرح کی تصویریں گھومتی رہیں۔ جیسے انسان کو سرسام یا ہائی بلڈ پریشر کے حملے کے دوران انوکھے نظارے دکھائی پڑتے ہیں۔ رنگ برنگے موتیوں کی جھالریں،سمندر ،بے تکی شکلیں ،آگ اور آوازیں۔ شاید وہClareaudience کا شکار بھی بیٹھا باتیں کررہا ہو اور ٹرین کی گڑگڑاہٹ ۔ میں نے تمہاری بات سنی تھی۔ جس شخص کو یہ معلوم ہوکہ عنقریب موت کے منھ میں جانے والا ہے ،وہ سخت دل ہوجاتا ہے۔ یہ ہمارا سنگتروں کا باغ تھا۔تم نے کبھی مجھ سے نہ پوچھا کہ میرا گھر کہاں ہے۔

ونڈرفل۔ میں تمہاری زندگی ہوں !ہاہا میری زندگی۔جان من۔ چلو وقت نہیں ہے۔ وقت بہت کم ہے۔ قربون۔ میری لڑکی کا منگیتر۔ بہت خطر ناک زندگی ہے اس بیچارے کی۔ مجھے عربی نہیں آتی۔ ہلوترکان خاتون۔ میں ایسے وعدے کبھی نہیں کرتا جو نبھا نہ سکوں۔تم میری بنتِ عم ہوتو سہی۔آل اسحٰق ۔آل اسمٰعیل ۔ میں بنی آدم کے شجرے کے اس گھپلے پر مزید روشنی ڈال سکتا ہوں۔ لیکن تمارا خانم کھانا شروع کرو۔ دیکھو نصرت خطرے میں نہ پڑنا۔ ہر طرف دنیا میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ اپنا خیال رکھو۔ اچھا رکھوں گا۔شہزادی ساقی بیگم ۔

www.urduacademyts.com

اندھیرا پڑے، پالا اس کی روم میٹ کمرے میں آئی ۔روشنی جلا کر تمارا کی طرف دیکھے بغیر بے دھیانی سے میکانکی انداز میں ہاتھ بڑھا کر ٹیلی ویژن کا سوئچ آن کیا اور گنگناتی ہوئی بالکنی میں چلی گئی۔

تمارا نے کروٹ بدلی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے برفیلی ٹیلی اسکرین دیکھنے لگی۔

کچھ دیر بعد نیوز ریل شروع ہوئی۔ اچانک اس کا کلوزاپ سامنے آیا۔آدھا چہرہ آدھا دستی بم سے اڑچکا تھا۔صرف پر وفائل باقی تھا دماغ بھی اڑچکا تھا۔ ائیر پورٹ کے چمکیلے شفاف فرش پر اس کا چہرہ بکھرا پڑا تھا اور انتڑیاں ۔ سیاہ جما ہوا خون۔کٹا ہوا ہاتھ ۔کارتوس کی پیٹی۔ گوشت اور ہڈیوں کا مختصر سامل غوزہ تم بہت اچھے اداکار ہو۔کم ازکم ٹی۔ وی اسٹار تو بن سکتے ہو۔ واقعی؟ جلدتم مجھے ٹی وی اسکرین پر دیکھ لوگی۔

کمیرہ پیچھے ہٹا۔ لالہ کا ایک گلدستہ جو بھگدڑ میں کسی مسافر کے ہاتھ سے چھٹ کر گر گیا تھا۔ برابر میں نصرت الدین کا کٹا ہوا ہاتھ لالہ کے پھول اس کے خون میں لت پت ۔پھر اس کا آدھا چہرہ ،پھر گوشت کامل غوزے کو اتنے قریب دیکھ کر تمارا کو ابکائی سی آئی۔ وہ چکرا کر اٹھی اور غسل خانے کی طرف بھاگنا چاہا۔ اس کی ہیبت زدہ چیخ سن کر پالا، اس کی روم میٹ بالکنی سے لپکی ہوئی آئی۔

تمارا نے دیکھا پالا کا چہرہ نیلا اور سفید تھا۔ پالا نے فوراً ٹیلی ویژن بند کیا اور اسے فرش پر سے اٹھانے کے لئے جھکی۔

پالا کے سر پر سفید اسکارف بندھا تھا جیسے نرس آپریشن ٹیبل پر سرطان کے مریض کو لٹاتی ہو۔ اسے ایک ٹرالی پر بٹھا کر گیس چیمبر کے اندر لے جایا جارہا تھا اور برابر کی بھٹی میں انسان زندہ جلائے جارہے تھے ۔ان کا سیاہ دھواں چمنیوں میں سے نکل کر آسمان کی نیلاہٹ میں گھلتا جارہا تھا۔

اب وہ ایک نیلے ہال میں تھی۔ دیواریں فرش ،چھت برف کی طرح نیلی اور سرد۔ کمرے

www.urduacademyts.com

کے بعد کمرے میں سفید آتشدان کے پاس ایک نیلے چہرہ والی عورت کھڑی تھی۔ شکل سے سنٹرل یورپین معلوم ہوتی تھی۔ پورا سراپا ایسا نیلا پروف جو ابھی پریس سے تیار ہو کر نہ نکلا ہو۔

ایک اور ہال ۔ اس کے وسط میں قالین بافی کرگھا۔ کرگھے پر آدھا بنا ہوا قالین۔ اس پر ''شجرِ حیات'' کا ادھورا نمونہ۔

''یہ شجرِ حیات کیا چیز ہے نصرت الدین؟''

''مڈل ایسٹ کے قالینوں کا موتیف خانم جون۔''

کرگھے کی دوسری طرف سر پر رومال باندھے دو مڈل ایسٹرن عورتیں ۔پھر بہت سے پردے جیسے محلات میں ہوتے ہیں۔ اطلسی آبشار۔ وہ پردوں کے انبار میں الجھ گئی۔ پھر اس نے بگٹٹ بھاگنا شروع کیا مگر گیلری طویل ہوتی چلی گئی۔ وہ نیچے اتری۔ جیسے بنک کے تہ خانے ہوتے ہیں۔ چمکیلی سنگلاخ دیواریں، چمکیلا فرش یا جیل خانے کے اندر ،سناٹا، اب وہ ایک بہت وسیع سرنگ میں چل رہی تھی۔ اچانک اسے چند کیچڑ کے آدمی نظر آئے ۔وہ اس سرنگ یا انڈر گراؤنڈ ریلوے کے سنسان کوریڈور میں ایک مین ہول کے اندر اور اس کے گرد پھاوڑے لئے کھڑے تھے۔ کیچڑ کے چہرے۔ کیچڑ کی وردیاں انھیں دیکھ کر استہزاء سے ان سے وہ بھاگتی ہوئی باہر نکلی ۔عین سامنے چوڑا دروازہ تھا۔ دروازے کے باہر شہر کا بازار' بارش ہو رہی تھی۔ ٹرامیں ٹن ٹن کرتی گزر رہی تھیں۔ دروازے کے برابر ایک پھول والی برساتی اوڑھے بیٹھی پھول بیچ رہی تھی ۔اس نے قریب جا کر اس عورت کو چُھوا' عورت مردہ تھی ۔

اسے کوئی تعجب نہ ہوا۔ آگے بڑھی ۔سڑک پر مُردوں کا ہجوم تھا' بسیں اور ٹرامیں مُردے چلا رہے تھے ۔ دکانوں میں خرید و فروخت مُردے کر رہے تھے ۔ ایک تھیٹر ہال میں جھانکا ۔اسٹیج پر'' سوان لیک'' میں مُردے رقصاں تھے اور تماشائی بے جان تھے ۔

'' یہ زومی ہیں یا نامی ؟'' اس نے ایک آدمی سے پوچھا جو تیز قدم رکھتا اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔

www.urduacademyts.com

'' قیں فتیں'' اس آدمی نے مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر جواب دیا ۔'' زومبی نہیں ماموزیل خالص ۔ اصلی مُردے ۔''

وہ آدمی بہت لمبا تھا ۔ تاڑ کا تاڑ ۔ گرے کوٹ میں ملبوس ۔ مفلر سے سر چھپائے مستقل مونچھوں پر ہاتھ رکھ کر بولتا تھا ۔ اس کی آنکھیں ٹریفک بتیوں کی مانند کبھی سُرخ ہو جاتیں کبھی سبز ۔ اچانک اس نے تمارا کا ہاتھ پکڑلیا ۔ اس کا پنجہ لوہے کا تھا ۔'' اِکس کیوزمی'' تمارا نے نرمی سے کہا اور ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہوئی ایک بس میں سوار ہوگئی ۔

'' یہ زندوں کا قبرستان ہے ۔'' تمارا نے اپنے آپ کو بتایا ۔ اب اُسے ساری باتیں آپ سے معلوم ہوتی جارہی تھیں ۔ میں چیزوں کو ان کے اصل بنیادی روپ میں دیکھ رہی ہوں ۔

اندر جا کر اس نے ایک ایئر کنڈیشنڈ قبر میں جھانکا ۔ یہ ایک Split level قبر تھی ۔ اندر رنگین ٹیلی ویژن کے سامنے زندہ لوگ بیٹھے شراب پی رہے تھے ۔ ٹیلی ویژن پر سنٹرل یورپین نیلے چہرے والی عورت'' للّی مارلین'' گارہی تھی ۔ اس نے ۱۹۱۶ء کے فیشن کا لباس پہن رکھا تھا ۔

گڑگڑاہٹ کے ساتھ خبریں شروع ہوگئیں ۔ وہ خبریں سننا نہ چاہتی تھی اس لئے بھاگی ۔

راستے میں اس نے دیکھا کہ جنازے قبرستان سے الٹے گھروں کی طرف جارہے تھے ۔

قبریں زندوں سے بھرگئی ہیں جگہ نہیں ملی ۔ اس نے اپنے آپ کو بتایا اور شہر واپس آئی ۔ یہاں حسب معمول ہر جگہ مردے ہی مردے تھے ۔ دفتروں میں' کارخانوں میں' ہر جگہ بعض مردوں نے پچھلی صدیوں کے لباس پہن رکھے تھے ۔ اس کے سامنے ایک سولہویں صدی کا برطانوی بادشاہ اپنا تاج سیدھا کرتا ذرا جھینپا جھینپا کیوں کہ اس کا شاہی لباس بے حد شکن آلود اور بوسیدہ تھا ۔ تابوت سے اٹھا اور جا کر منیجر کی کرسی پر گم سم بیٹھ گیا اور مٹی کے رنگ کی بھری بھری داڑھی پر ہاتھ پھیرتا رہا ۔

باہر پارک میں اٹھارہویں صدی کی مردہ عورتیں سائیکل چلانے کی مشق کررہی تھیں ۔ ان کے چہرے مٹی کے تھے ۔

www.urduacademyts.com

''یہ ان لوگوں کو کیوں بلایا گیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

'' جنرل لام بندی ۔'' ایک گیارہویں صدی کے نارمن کسان نے جواب دیا اور سر جھکائے پارک کی کیاری میں کدال چلاتا رہا۔ اس کے ہاتھ بالکل خشک اور سیاہ تھے ۔

تب اس نے سوچا وقت دعا ہے ۔ توبہ استغفار ۔ توبہ استغفار ۔ ایک عظیم الشان صومو فوراً اس کے سامنے آ گیا ۔ وہ سر پر رومال باندھ کر اس کے صدر دروازے کی طرف بڑھی ۔ اندر ربائی نمازِ عشاء پڑھنے میں مصروف تھا ۔ دروازے کی محراب کے نیچے ایک آدمی گھٹنوں میں منھ چھپائے بیٹھا سر پہ خاک ڈال رہا تھا ۔

''معاف کیجئے گا آپ حضرت ایوبؑ ہیں ۔'' اس نے ادب سے جھک کر دریافت کیا ۔

''نہیں میں بلبلا کر خدا کو پکارتا ہوں مگر منھ سے صرف گالیاں نکلتی ہیں ۔'' آدمی نے سر اٹھا کر جواب دیا

'' آپ ابلیس ہیں ؟''

'' یا ابلیس' یا مجذوب یا محض نروس بریک ڈاؤن کا شکار ۔'' اس نے جواب دیا اور مزید راکھ سر پر ڈالی۔

'' آپ نے ایل ۔ ایس ۔ ڈی بہت نوش جان کی ہوگی' آپ کی روح کو کیا تکلیف ہے ۔''

'' روح ؟ روح گئی چولھے بھاڑ میں' کیسی روح ؟'' اس نے جواب دیا اور بال نوچے ۔ میں چیزوں کو ان کے بنیادی روپ میں دیکھ رہی ہوں ۔ اس نے دل میں دہرایا اور خود کو بہت عاقل اور ہلکا پھلکا محسوس کیا ۔ وہ ایک انڈر گراؤنڈ میں موجود تھی ۔ ٹرین کبھی کھچا کھچ بھر جاتی کبھی ایک دم خالی ۔ اس میں دنیا بھر کی قوموں کے لوگ سوار تھے اور زمین کے نیچے نیچے آواز سے زیادہ تیز رفتاری سے ساری دنیا میں گھوم رہی تھی ۔ سرحدوں کے بعد سرحدیں ۔

اور الجزائر

اور سنائی

www.urduacademyts.com

اور سوریہ

اور

ٹرین سمندر کے نیچے سے نکل کر ایک تپتے ہوئے صحرا میں آ گئی اور بغیر پٹریوں کے ریت پر چلنے لگی اور گڑگڑاتی ہوئی سامنے پڑے سرخ رومن کھنڈروں میں گھس گئی ۔

اور ٹائیر

اور صدون

اور نینوا

افق پر سنسان خیموں کے پردے بادسموم میں پھٹ پٹھار ہے تھے ۔ سارے میں جلی ہوئی رسیاں اور جلے ہوئے پردے اور بچوں کی ننھی منّی جوتیاں بکھری پڑی تھیں ۔ بہت دور فرات بہہ رہا تھا ۔ اس کے کنارے ایک گھوڑا زور سے ہنہنایا اور کسی نے بڑی کر بناک آواز میں پکارا العطش العطش ۔ اس کے کیا معنی ہیں اس کی سمجھ میں نہ آیا کیوں کہ اسے کوئی زبان نہ آتی تھی سوا اپنی زبان کے ۔ میں اب واپس جانا چاہتی ہوں ۔ میں وہاں ہو آئی ہوں' وہاں کچھ نہیں ہے' پرچھائیوں کی پرچھائیاں ہی ہیں ۔

لیکن آواز برابر گونج رہی تھی ۔ العطش ۔

پھر ایک لرزہ خیز چیخ بلند ہوئی العطش ۔

اچانک سورج کی روشنی بہت تیز ہوگئی ۔ تباہ شدہ خیمہ گاہ اب صاف اور بہت قریب نظر آرہی تھی ۔

'' آج خیمہ گاہوں پر پھر بمباری کی گئی ہے ۔'' جرمن نیوز کاسٹر نے کہا ۔

تیسرے روز جب اس کی طبیعت سنبھلی اور وہ کلاس کے بعد لنچ کے لئے اسی کیفے ٹیریا میں گئی ۔ دریچے کے سامنے والی میز پر اس وقت دو ہندوستانی طالب علم بیٹھے کافی پی رہے تھے ۔ ان کے سامنے تازہ اخبار رکھا تھا جس میں '' نصرت الدین '' اور اس کے ساتھیوں کی مزید

www.urduacademyts.com

تصویریں اور تفصیلات چھپی تھیں ۔ تمارا جلدی سے کاونٹر کے پاس جا کر قطار میں لگ گئی ۔

بیاباں میں ہے ۔

بیاباں میں ہے۔

دونوں طالب علم کسی اجنبی زبان میں بات کر رہے تھے اور ان کے جوش و خروش سے اندازہ ہوتا تھا کہ شعر پڑھ رہے ہیں ۔ (جیسے وہ فارسی اشعار اسے سنایا کرتا تھا)

آلتس لینڈ کی طرح دنیا میں کتنی زبانیں ہیں جو تمارا کو نہیں آتیں ۔ کتنے جذبات تصورات' نظریے' خواب' کرب اندوہ جن سے وہ واقف ہونا نہیں چاہتی ۔ کافی کچھ جاننے کے باوجود منتظر لالہ کب سے ۔ کانٹا' چمچے اور پلیٹ اُٹھا کر وہ قطار میں آگے سرکی ۔

قہبا چاہئے ۔ قہبا چاہئے

اس کو خون مرغوب ہے ۔

سامنے سے تمارا گرین برگ کو اپنی ٹرے اُٹھائے آتا دیکھ کر وہ لڑکے معاً خاموش ہو گئے ۔

***

www.urduacademyts.com

مجتبیٰ حسین

مجتبیٰ حسین 1932ء گلبرگہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم عثمانیہ یونیورسٹی میں ہوئی۔ گھر کا ماحول علمی و ادبی تھا چنانچہ مجتبیٰ صاحب نے علمی و ادبی مشاغل سے دلچسپی لی۔ مزاح نگاری کا آغاز اخبار ''سیاست'' کے شیشہ و تیشہ کالم سے ہوا۔ فطری مناسبت اور صلاحیت نے اس میں غیر معمولی کامیابی سے ہمکنار کیا۔ ملازمت کے سلسلے میں دہلی میں قیام پذیر رہے۔ بے شمار مضامین اور مجموعے زیور طباعت سے آراستہ ہیں۔ جن میں تکلف برطرف، قطع کلام، سو ہے وہ بھی آدمی، بالآخر وغیرہ چند اہم نام ہیں۔

''پدم شری'' کے اعزاز سے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ بین الاقوامی محافل میں آپ کو مدعو کیا جاتا ہے۔ وظیفہ پر سبکدوشی کے بعد سے حیدرآباد میں مقیم ہیں۔

مجتبیٰ حسین مزاح نگاروں میں انفرادی مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔ آپ کو زبان پر دسترس حاصل ہے۔ بات میں سے بات پیدا کرنے کا ہنر بڑی مہارت سے برتتے ہیں۔ آپ کی تحریر سادہ رواں اور شگفتہ ہوتی ہے۔

قدیم و جدید ادبی شخصیات کے دلچسپ خاکے لکھنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ حسن چشتی نے آپ کے بے شمار مضامین اور خاکوں کا انتخاب دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ اردو مزاح نگاری کی تاریخ مجتبیٰ حسین اور ان کی ادبی خدمات کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔

☆☆☆

www.urduacademyts.com

سلیمان اریب

میں جب بھی معظم جاہی مارکٹ پر واقع مجردگاہ کے کمرہ نمبر ۱۷ پر جاتا ، اور اریب کے ہمراہ کسی ایسے شخص کو دیکھتا جو میرے لئے اجنبی ہوتا تو میں فوراً وہاں سے بھاگ جانے کی کوشش شروع کردیتا۔ کیوں کہ ایک اجنبی کی موجودگی میں اریب سے ملنا کم ازکم میرے لئے بہت تکلیف دہ ہوا کرتا تھا۔ ایسی صورتوں میں وہ میرے پہنچتے ہی کہا کرتے ’’ اچھا ہوا تم آگئے۔ ان سے ملو۔ یہ فلاں صاحب ہیں لکھنو سے آئے ہیں۔تم انہیں ذرا وہ لطیفہ تو سنادو۔‘‘

میں انجان بن کر پوچھتا ’’کون سا لطیفہ‘‘؟

’’ ارے وہی لطیفہ جوتم نے میرے بارے میں گڑھا ہے۔ وہی میستری والا۔‘‘ میں شدید کرب میں مبتلا ہوجاتا ، کیوں کہ اریب مجھے ہر بار مجبور کیا کرتے تھے کہ میں اس لطیفہ کو ہر نئے آنے والے شخص کے سامنے سناؤں، میں اُن کی بات کوٹال جانے کی کوشش کرتا مگر وہ مسلسل اصرار کرتے کہ ’’ارے بھئی! سنادو۔ یہ سننا چاہتے ہیں۔‘‘

میں رونی صورت بنا کر لطیفہ سنانا شروع کردیتا ’’ اچھا صاحب سنئے۔لطیفہ صرف اتنا ہے کہ اریب اپنے مکان کی کمپاؤنڈ وال کو اونچا کرنا چاہتے تھے۔ ایک بار انہوں نے اس کا ذکر ایک میستری سے کردیا۔ بدقسمتی سے یہ میستری سخن فہم ہونے کے علاوہ اریب کا مداح بھی تھا۔ گویا کریلا وہ بھی نیم چڑھا۔اب وہ ہر روز اریب کے گھر پہنچتا اور پوچھتا کہ کمپاؤنڈ وال کی تعمیر کا کام کب سے شروع ہونے والا ہے؟

اریب کہتے ’’بھئی ابھی تو پیسوں کا بندوبست نہیں ہوا ہے۔ پیسہ آئے گا تو میں دیوار کی تعمیر کے لئے درکار مال خریدوں گا اور تمہیں اطلاع دوں گا۔‘‘

اس کے باوجود میستری اریب کے مکان پر پہنچتا اور دیوار کی تعمیر کے لئے اُن سے

www.urduacademyts.com

اصرار کرتا۔ اریب ہمیشہ یہی عذر کر کے اسے ٹال دیتے کہ ابھی پیسہ کا بندوبست نہیں ہوا ہے مگر وہ میستری کب ہار ماننے والا تھا۔ ایک دن وہ اپنے ساتھ اینٹیں اور گارا لے کر اریب کے گھر پہنچ گیا اور کہنے لگا۔

''اتفاق سے میرے پاس اینٹیں آگئی ہیں۔ آپ مجھے ان اینٹوں کی قیمت اس وقت ادا کیجئے جب آپ کے پاس پیسے آئیں۔ آپ کا بڑا مسئلہ تو حل ہوگیا ہے۔ اب آپ صرف مزدوروں کی اُجرت ادا کرنے کا انتظام کیجئے۔ مال تو آگیا ہے۔''

اس پر اریب نے کہا ''بھائی سچ بات تو یہ ہے کہ میں مزدوروں کی اُجرت کا بندوبست بھی نہیں کرسکتا۔ لہٰذا فی الحال اس مسلہ کو ملتوی ہی رکھو۔''

اس پر میستری نے قدرے جھلا کر کہا ''آخر آپ پر ایسی کون سی آفت آن پڑی ہے کہ مزدوروں کی اُجرت بھی ادا نہیں کرسکتے۔''

اریب مسکراتے ہوئے بولے ''بھائی اصل قصہ یہ ہے کہ 'صبا' ابھی تک پریس میں ہے۔ وہ چھپ جائے گا تو اشتہارات کی رقم ملے گی۔ اس سے پہلے میں پیسہ کہاں سے لاؤں گا؟''

تب میستری نے عاجز ہوکر کہا ''صاحب آپ سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ آپ آج ہی سے 'صبا' کو میرے حوالے کردیجئے۔ میں آئندہ سے 'صبا' بھی نکالوں گا اور آپ کی کمپاؤنڈ وال بھی تعمیر کردوں گا۔''

لطیفہ ختم ہوتا تو اریب زوردار قہقہہ لگاتے اور فرطِ مسرت میں اجنبی سے یوں مصافحہ کرتے جیسے لطیفہ میں نے نہیں خود اریب نے سنایا ہو۔

میں انہیں کہتا ''اریب صاحب۔ لطیفہ تو آپ کو پسند آیا مگر اس نکتہ پر بھی غور کیجئے کہ لطیفہ کی رو سے ''صبا'' ایک ایسا رسالہ بن جاتا ہے جسے نکالنے کے لئے ایک عدد سلیمان اریب کی نہیں بلکہ ایک میستری کی ضرورت پیش آتی ہے۔'' اس پر اریب پھر قہقہہ لگا کر اجنبی

www.urduacademyts.com

سے مصافحہ کرتے۔ ابھی پہلے لطیفہ کی ہنسی ختم بھی نہیں ہوتی کہ اریب کہتے۔ ''اچھا وہ لطیفہ تو سناؤ۔''

میں پھر انجان بن کر پوچھتا ''کون سا لطیفہ؟''

''ارے وہی جامی صاحب والا۔''

میں اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھ کر طوعاً و کرہاً لطیفہ سنانے لگتا۔لطیفہ یہ ہے کہ ایک بار کسی چھوٹی سے بات پر اریب صاحب اور جامی صاحب میں اَن بَن ہوگئی۔ ایک دن جامی صاحب اورینٹ ہوٹل میں بیٹھے اریب کا مذاق اُڑا رہے تھے کہ میں نے پوچھا۔

''جامی صاحب! جب آپ اریب کو بڑا شاعر نہیں مانتے تو پھر آپ نے اپنے پہلے مجموعہ کلام میں اریب کی رائے کیوں شائع کی ہے؟''

اس پر جامی صاحب نے اپنے تاریخی جھٹکے کے ساتھ کہا ''ہیں! تبھی تو اریب کی رائے میں نے گرد پوش پر چھاپی ہے۔ بھلا گرد پوش بھی کبھی کتاب کا حصہ بن سکتا ہے؟''

اریب کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوجاتی اور وہ اپنے لمبے لمبے بال چہرے کے سامنے پھینک کر ایک زوردار قہقہہ لگاتے اور پھر ایک بار اجنبی سے مصافحہ کرنے کا عمل دہرایا جاتا۔

میں اپنی جان چھڑا کر وہاں سے بھاگ جانے کی کوشش کرتا مگر اسی اثناء میں اریب پھر فرمائش کرتے ''اچھا اب وہ نوری والا لطیفہ تو سنادو.....''

اب کی بار میرے چہرے پر ایسے آثار نمودار ہوجاتے جیسے میں نے ارنڈی کا تیل پی لیا ہو۔مگر میں جانتا تھا کہ لطیفہ سنائے بغیر اریب مجھے جانے نہیں دیں گے۔

میں پھر لطیفہ سنانا شروع کردیتا اور اجنبی کی سہولت کے لئے کہنے لگتا ''اس لطیفے کو سمجھنے کے لئے آپ کا شاہ نوری سے واقف ہونا ضروری ہے۔ شاہ نوری اریب کے اسسٹنٹ کے طور پر ''صبا'' کا کام کرتے تھے۔ ایک دن ایک صاحب اپنے چپراسی کے ذریعہ اریب کو ایک خط بھیجنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے چپراسی کو بلاکر کہا۔'یہ خط لے کر کمرہ نمبر ۱۷ پر جاؤ

www.urduacademyts.com

اور وہاں سلیمان اریب کو دے آؤ۔'' چپراسی نے اریب کو پہچاننے سے انکار کرتے ہوئے کہا ''اگر آپ اُن کا حلیہ بیان کردیں تو مجھے پہچاننے میں آسانی ہوگی۔'' اُن صاحب نے کہا۔ ''ارے تم سلیمان اریب کونہیں جانتے۔ لمبے لمبے بال رکھتے ہیں، اونچے پورے ہیں، گورا سا رنگ ہے.....'' چپراسی نے پھر بھی اُنہیں پہچاننے سے انکار کردیا۔

تب ان صاحب نے کہا۔ ''ارے بھئی سلیمان اریب کو کون نہیں جانتا، مشہور شاعر ہیں، چہرے پر چیچک کے داغ ہیں۔ کرتا اور پاجامہ پہنتے ہیں۔''

اس پر چپراسی نے اچانک دماغ پر زور دیتے ہوئے پوچھا ''صاحب آپ کا اشارہ کہیں اُن صاحب کی طرف تو نہیں ہے جو اکثر شاہ نوری کے ساتھ گھومتے رہتے ہیں۔''

اس پر اریب پھر ایک قہقہہ لگا کر کہتے ''لیجئے صاحب! یہ حیثیت ہوگئی ہے ہماری کہ لوگ شاہ نوری کے توسط سے ہمیں پہچاننے لگے ہیں جیسے ہماری کوئی حیثیت ہی نہ ہوئی۔''

میں یہ لطیفہ سنا کر کافی مطمئن ہوجاتا کیوں کہ اریب کے بارے میں میرے پاس صرف تین ہی لطیفے تھے۔ اریب اکثر پوچھتے ''تم نے میرے بارے میں صرف تین ہی لطیفے کیوں بنائے ہیں؟''

میں کہتا، اریب صاحب! سچ تو یہ ہے کہ میں آپ کے بارے میں سینکڑوں لطیفے بنا سکتا ہوں، لیکن مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ میں ایک ہی لطیفہ کو سینکڑوں مرتبہ سناؤں۔ میں تو یہ تین لطیفے بنا کر ہی پچھتا رہا ہوں۔ جب بھی باہر سے کوئی مہمان آتا ہے یا کوئی ادبی شخصیت آتی ہے تو آپ اکبر اعظم بن جاتے ہیں اور میں صرف ملا دو پیازہ بن کر رہ جاتا ہوں۔ آخر میری بھی تو کوئی حیثیت ہے، اریب اس بات پر بھی مسکراتے۔

میں نے بہت سی زندہ دل شخصیتیں ایسی دیکھی ہیں جو اپنے بارے میں لطیفے سن کر ناک بھوں چڑھانے لگتی ہیں مگر اس معاملہ میں اریب کا حال جداگانہ تھا۔ وہ اپنے بارے میں ہونے والے مذاق کو عام کرنا چاہتے تھے بلکہ ایک نوبت تو وہ بھی آتی تھی جب لطیفہ گھڑنے والا

www.urduacademyts.com

خود ایک لطیفہ بن جایا کرتا تھا۔

اریب کو سب سے پہلے میں نے ۱۹۵۲ء میں گلبرگہ میں دیکھا تھا۔ ہم لوگوں نے گلبرگہ میں ایک کل ہند مشاعرہ کا اہتمام کیا تھا جس میں اریب شرکت کے لئے آئے تھے۔ میں اس مشاعرہ کا معتمد تھا۔ میری عمر یہی کوئی سترہ سال کی ہوگی۔ گویا یہ وہی عمر تھی جہاں سے آدمی اپنی زندگی میں لغزشوں کا آغاز کرتا ہے۔ اس عمر میں آدمی شعر کا مفہوم تو سمجھنے لگتا ہے لیکن شعر پر عمل کرنے کی ہمت اس میں نہیں ہوتی۔ آدھی رات کا وقت تھا جب اریب اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ٹرین سے گلبرگہ اسٹیشن پر اُترے تھے۔ اریب اپنے ساتھیوں سے باتیں کررہے تھے اور بات بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔ یقین مانئے زندگی میں پہلی بار مجھے شاعروں کو دیکھنے کا موقع مل رہا تھا، میں نے احتیاطاً ایک آٹوگراف بُک بھی خریدلی۔ میں چونکہ مشاعرہ کا معتمد تھا اسی لئے مجھے ڈر تھا کہ کہیں انتظامات کی گڑبڑ میں مجھے شاعروں کے آٹوگراف لینے کا موقع نہ مل سکے۔ اسی لئے اسٹیشن پر ہی میں نے اپنی آٹوگراف بک سب سے پہلے اریب کی جانب بڑھادی۔ انہوں نے گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا :

''رات کے دو بج رہے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی وقت ہے آٹوگراف لینے کا؟''

شاہد صدیقی نے ، جو برابر ہی کھڑے تھے، اچانک کہا ''اریب تم وقت نہ دیکھو بلکہ فوراً اپنے آٹوگراف دے دو۔ یہ لوگ کل تمہاری شاعری سن لیں گے تو شاید تم سے آٹوگراف لینے نہ آئیں۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ مشاعرہ سے پہلے ہی آٹوگراف دے دو۔ تمہیں دوسروں کی غفلت سے پورا پورا فائدہ اُٹھانا چاہئے۔''

اریب نے کہا ''ایسی بات ہے تو پھر مجھے ابھی اپنے آٹوگراف دے دینا چاہئے۔''

یہ کہتے ہوئے اریب نے فوراً قلم نکالا اور آٹوگراف بک پر دستخط کردیئے۔ مشاعرہ میں اریب نے بڑی جاندار نظم سنائی۔ مجھے اریب کی اس نظم کے کئی بند آج بھی یاد ہیں اور وہ آٹوگراف بک آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ پھر کئی برس بیت گئے۔ میں گلبرگہ سے حیدرآباد آ گیا اور

www.urduacademyts.com

ادبی محفلوں میں اریب سے لگاتار اور مسلسل ملاقاتیں ہونے لگیں اور مجھے انہیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

اریب ان لوگوں میں سے تھے جن سے آپ کا جی خواہ مخواہ ملنے کو چاہتا ہے۔ چنانچہ اریب کے اطراف بہت سے لوگ خواہ مخواہ جمع رہا کرتے تھے۔ میں نے جب بھی اریب کو دیکھا انہیں خواہ مخواہ لوگوں میں گھرا ہوا دیکھا۔ وہ خواہ مخواہ گھنٹوں دوستوں کے ساتھ بیٹھا کرتے اور خواہ مخواہ اُن سے بحثیں کیا کرتے تھے۔ کمرہ نمبر ۱۷ ویسے تو ''صبا'' کا دفتر تھا مگر عملاً یہ اریب کے دوستوں کا اڈّہ تھا۔ وہ صبح میں اس ارادے کے ساتھ اپنے گھر سے نکلتے تھے کہ دفتر میں بیٹھ کر کام کریں گے لیکن ''صبا'' کے دفتر پر پہنچتے تو دوستوں کے نرغے میں پھنس جاتے۔ دن بھر گپیں ہوتیں، چائے کے دور چلتے اور محفل کمرہ نمبر ۱۷ سے اُٹھ کر سڑک پر جاری رہتی۔ اریب ہر روز اپنے ساتھ بیگ لے کر آتے، لیکن کبھی اس بیگ کو کھولنے کی نوبت نہ آتی۔ یہاں تک کہ ''صبا'' لیٹ ہوجاتا۔ خریداروں کے خطوط آنے لگتے، ایجنٹ یاددہانی کرانے لگتے۔ لیکن اریب کی بے نیازی میں کوئی فرق نہ آتا۔ میں اریب سے کہا کرتا ''صبا'' اُردو کا واحد ماہنامہ ہے جو سال میں چار مرتبہ بڑی پابندی سے شائع ہوتا ہے۔''

اریب کے اطراف بھانت بھانت کے لوگ جمع رہتے تھے۔ ایسے لوگ بھی رہتے تھے جن سے کوئی شاعر یا ادیب چند منٹ کے لئے بھی بات نہیں کرسکتا مگر اریب ان سے گھنٹوں باتیں کیا کرتے تھے۔ اریب کی ذات ایک ایسا گھاٹ تھی جس پر شیر اور بکری دونوں ایک ساتھ پانی پیا کرتے ہیں۔ حیدرآباد کا کوئی بھی مشاعرہ اریب کے بغیر نہ تو کامیاب ہوسکتا تھا اور نہ ہی فیل ہوسکتا تھا۔ بہت کم شعراء ایسے ہوں گے جن میں بیک وقت مشاعرہ کو کامیاب بنانے اور اسے فیل کرنے کی اتنی بڑی صلاحیت موجود ہو۔ اریب چاہتے تو مشاعرے کو بڑی بلندی تک لے جاتے اور کبھی بگڑ جاتے تو مشاعرہ کو بچہ کے کھلونے کی طرح توڑ تاڑ کر پھینک دیتے اور بڑی معصومیت کے ساتھ ٹوٹے ہوئے مشاعرے کی طرف دیکھتے۔ میں تو کہتا ہوں

www.urduacademyts.com

کہ حیدرآباد کے مشاعروں کی آدھی فضاء اریب ہی بنایا کرتے تھے اور بقیہ آدھی دوسرے سارے شعراء مل کر بناتے تھے۔ شعر سنا کر سماں باندھنا تو سب کو آتا ہے لیکن اریب مشاعرہ میں صرف اپنی مخصوص آمد کے ذریعہ ہی سماں باندھ دیا کرتے تھے۔ مشاعرہ گاہ میں جب اریب داخل ہوتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے سچ مچ ایک شاعر چلا آرہا ہے۔ بہکتی ہوئی چال، اطراف دوستوں کا ہجوم۔ یوں لگتا جیسے اریب کو پابہ زنجیر کرکے مشاعرہ میں لایا جارہا ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ رک جاتے۔ سامعین پر پلٹ کر نگاہ ڈالتے۔ کوئی شناسا نظر آتا تو لہراتا ہوا سلام کردیتے۔ اگر بہت زیادہ موڈ میں ہوتے تو سامعین کی بھیڑ کو چیرتے ہوئے اپنے شناسا تک پہنچنے کی کوشش کرتے اور ان کے احباب انہیں زبردستی روکنے کی کوشش کرتے تھے۔ اریب اپنی مخصوص آمد کے ذریعہ ہی سامعین سے داد وصول کرلیا کرتے تھے۔ شعر سنا کر داد وصول کرنے کی نوبت بعد میں آتی۔ اریب کے انتقال پر مجھے سب سے زیادہ دُکھ اس احساس سے ہوا کہ اب حیدرآباد میں کوئی ایسا شاعر باقی نہیں رہ گیا جو اریب کی سی شاعرانہ سج دھج کے ساتھ مشاعرہ گاہ میں داخل ہوسکے۔ اب شعراء مشاعرہ گاہ میں یوں پہنچتے ہیں جیسے کلام سنانے نہ آئے ہوں بلکہ کسی گھر میں نقب لگانے آئے ہوں۔ اریب اس دھوم دھام اور سج دھج کے ساتھ مشاعرہ گاہ میں آتے کہ یوں محسوس ہوتا جیسے مشاعرہ سے پہلے ہی انہوں نے مشاعرہ لوٹ لیا ہو۔ پھر کلام یوں سناتے جیسے وہ ڈائس پر نہیں دیوان خانہ میں بیٹھے ہوں۔ سامعین سے بے تکلف گفتگو ہوتی تھی۔ سامعین کے سوالات کے جوابات دیئے جاتے تھے۔ آخری زمانے میں تو وہ کلام کم سناتے تھے اور سامعین سے گفتگو زیادہ کرتے تھے۔ یوں تو اریب اپنی غزلیں اکثر ترنم سے سنایا کرتے تھے۔ مگر میں ان سے کہا کرتا تھا کہ اریب صاحب آپ کا ترنم تو تحت اللفظ ترنم ہوا کرتا ہے۔ اس پر وہ کہتے ''بھئی شاعر اور قوال میں کچھ فرق تو ہونا ہی چاہئے۔''

صفیہ (مسز اریب) اریب صاحب کی سب سے بڑی کمزوری اور سب سے بڑی طاقت تھیں۔ ہر بات میں صفیہ کا بے موقعہ ذکر کیا کرتے تھے۔ ایک دن فراقؔ کی شاعری پر

www.urduacademyts.com

بحث ہورہی تھی۔ کسی نے فراقؔ کی شاعری کے بارے میں کہا کہ پروفیسر احتشام حسین کی یہ رائے ہے۔

اس پر اریب نے فوراً کہا ''اور صفیہ کی بھی یہی رائے ہے۔'' یہ کہہ کر وہ یوں مطمئن ہوگئے جیسے صفیہ کی رائے کے بعد اب پروفیسر احتشام حسین کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ دنیا کا کوئی بھی مسئلہ پیش ہوتا تو اریب اس میں صفیہ کی رائے کو ضرور شامل کردیتے تھے۔ اُن کی بات چیت کا نمونہ کچھ اس طرح ہوتا تھا:

'' عرب اسرائیل جنگ کے بارے میں امریکہ نے جو رویہ اختیار کیا ہے اس سے صفیہ متفق نہیں ہے۔'' '' مسز اندرا گاندھی انقلابی اقدامات کے ذریعہ ملک میں سوشلزم لانا چاہتی ہیں اور صفیہ کی بھی یہی رائے ہے۔'' ''اُردو بڑی شیریں زبان ہے کیوں کہ صفیہ کی یہی رائے ہے۔''

ایک دن انہوں نے دوست احباب کی ایک محفل میں کوئی پندرہ سولہ مرتبہ صفیہ کی رائے کا ذکر کیا۔ محفل برخواست ہونے لگی تو اریب کے ایک بے تکلف دوست نے کسی بات پر اریب سے کہا ''اریب تم بڑے احمق اور بے وقوف آدمی ہو۔'' اس پر میں نے فوراً لقمہ دیا ''اور صفیہ کی بھی یہی رائے ہے۔'' اریب نے فوراً پلٹ کر مصافحہ کیا اور بڑی دیر تک ہنستے رہے۔

اریب کو اپنے اطراف نوجوان ادیبوں اور شاعروں کو جمع کرنے کا بڑا خاص ملکہ تھا۔ اریب ہی نے انہیں سب سے پہلے ''صبا'' میں چھاپا۔ غالباً ۱۹۶۱ء میں میں نے موت کے موضوع پر چند کہانیاں لکھی تھیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے لکھنا شروع ہی کیا تھا۔ ان کہانیوں کی اطلاع کسی طرح اریب تک پہنچ گئی۔ ایک دن میرے پاس آئے اور کہنے لگے ''سنا ہے کہ تم نے موت کے موضوع پر چند کہانیاں لکھی ہیں وہ کہانیاں پہلے 'صبا' کو دے دو۔'' میں نے کہا۔ ''اریب صاحب یہ کہانیاں بالکل رف حالت میں میرے پاس ہیں اور پھر

www.urduacademyts.com

یہ اتنی طویل ہیں کہ انہیں اب فیر کرنا مجھ سے ممکن نہیں ہے۔''

اریب نے زبردستی مجھ سے ایک کہانی کا مسودہ لیا اور کہا تم فکر نہ کرو میں اسے فیر کرلوں گا۔ وہ کئی دن تک اس مسودہ کو فیر کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر میری ہینڈ رائٹنگ کچھ ایسی ہے کہ بعض اوقات مجھے بھی اپنی تحریر کو پڑھنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ لہٰذا اریب چند دنوں بعد میرے پاس آئے تو ان کے ساتھ میری کہانی کا مسودہ تھا اور اس کے ساتھ چند کاغذات بھی تھے جن پر اریب نے میری کہانی خود اپنے ہاتھ سے فیر کی تھی۔ کہنے لگے ''تمہاری ہینڈ رائٹنگ اتنی خراب ہے کہ بڑی مشکل سے چند صفحات ہی فیر کرسکا ہوں اور وہ بھی نامکمل۔ اب بتاؤ میں کیا کروں؟''

میں نے کہا ''اریب صاحب! میری ہینڈ رائٹنگ کو پڑھنے کے لئے آدمی کا بہت زیادہ تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔''

اریب نے کہا ''لیکن میرا خیال ہے کہ تمہاری جیسی ہینڈ رائٹنگ لکھنے کے لئے آدمی کا پڑھا لکھا ہونا قطعاً ضروری نہیں ہے۔''

پھر مجھے یہ ذمہ داری سونپی کہ میں اسے فیر کرکے دے دوں۔ اسی اثناء میں میں نے مزاح نگاری کے میدان کو اپنایا اور وہ کہانیاں جوں کی توں پڑی رہیں۔ جب بھی اریب ملتے یہ ضرور پوچھتے کہ میں نے ان کہانیوں کا کیا کیا۔

میں ان سے کہتا ''اریب صاحب، اب ان کہانیوں کو چھوڑیئے۔ میں نے مزاح لکھنا شروع کردیا ہے، میں نے موت کے موضوع پر یہ کہانیاں لکھی تھیں اور اب چاہتا ہوں کہ یہ کہانیاں میری موت کے بعد ہی 'صبا' میں چھپیں۔'' اس پر اریب کہتے ''خیر ٹھیک ہے، میں تمہاری موت کا انتظار کرلوں گا۔ ابھی تو میں کافی جوان ہوں۔''

لیکن مزاح کے میدان میں بھی اریب نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ چنانچہ میرا پہلا مزاحیہ مضمون سب سے پہلے ۶۴ء میں 'صبا' میں چھپا۔

www.urduacademyts.com

نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی ہمت افزائی میں وہ اس قدر آگے نکل جاتے تھے کہ بعد کو نوجوان ادیب خود اُن سے بھی آگے نکل جانے کی کوشش کرنے لگ جاتے تھے۔ اریب کے ساتھ بے شمار بیٹھکیں ہوئیں۔ جب وہ ساری دنیا کو انگور کا پانی دینے کے موڈ میں ہوتے تو آپ اپنے کو یوں سمجھتے جیسے غالبؔ کے بعد اگر اُردو شاعری نے کوئی بڑا شاعر پیدا کیا ہے تو وہ خود ہیں۔ اس وقت وہ گردن اُٹھا کر دنیا کی طرف یوں دیکھتے جیسے وہ ہمالیہ کی چوٹی پر چڑھ گئے ہوں۔ اسی موڈ میں اریب کی اپنی ساتھیوں سے ان بن ہوجایا کرتی تھی۔ دوستوں سے خوب لڑتے جھگڑتے مگر دوسرے دن آتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں بلکہ دوستوں سے یہ تک نہ پوچھتے کہ انہوں نے رات میں کس کس سے کیا کہا تھا اور خود ہی اپنی باتوں پر ہنستے تھے۔

پھر اریب ایک دن اچانک بیمار ہوگئے۔ کسی نے بتایا کہ اُن کی آواز بیٹھ گئی ہے۔ ان دنوں ادب میں ترسیل کے مسئلہ پر رسالوں میں بڑی بحث چل رہی تھی۔ ایک دن اریب سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا ''اریب صاحب آپ تو سچ مچ ترسیل کا مسئلہ بن کر رہ گئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں جب سے آپ کی آواز بیٹھ گئی ہے آپ کو ترسیل کا مسئلہ بڑی آسانی سے سمجھ میں آرہا ہوگا۔''

اریب نے بیٹھی ہوئی آواز میں ہنسنے کی کوشش کی لیکن اُن کی آنکھوں نے بڑا زور دار قہقہہ لگایا۔ اریب کے ہونٹ کم مسکراتے تھے اور اُن کی آنکھیں زیادہ مسکراتی تھیں۔ پھر چند دنوں بعد ملے تو اُن کے گلے میں پلاسٹک کا ایک خول چڑھا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

کہنے لگے صفیہ نے گلے میں پٹہ باندھ دیا ہے۔

میں نے کہا ''اریب صاحب! آپ تو ہمیشہ پٹے تڑاتے رہے ہیں۔ اس پٹے کی کیا اہمیت ہے۔''

www.urduacademyts.com

بولے ''مگر کسی کسی پٹہ کو توڑنا بہت مشکل ہوتا ہے۔'' اریب نے یہ بات اس وقت کہی تھی جب اُن کی زندگی کا پٹہ ٹوٹنے لگا تھا۔ پھر چند دن بعد یہ اطلاع ملی کہ اریب کو کینسر ہوگیا ہے اور ہم سب لوگ اریب کو وداع کرنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ میں اُن کے پاس جلد جلد جانے لگا۔ موت اریب کے بہت قریب آ گئی تھی مگر اریب پھر بھی موت سے بہت دور تھے۔ وہ ہمیشہ یوں ہی مسکراتے جیسے پہلے مسکرایا کرتے تھے۔ اریب کی مسکراہٹ کینسر کی زد سے بہت پرے تھی۔ کینسر نے اریب کو تو زیر کرلیا تھا لیکن وہ ان کی مسکراہٹ پر کوئی کمند نہیں پھینک سکا تھا۔

اسی اثناء میں مخدوؔم بھی چل بسے۔ مخدوؔم کے جنازہ میں بھی میں نے اریب کے چہرہ پر مسکراہٹ دیکھی۔ جیسے وہ جانتے تھے کہ انہیں مخدوؔم کی موت پر آنسو نہیں بہانا ہے کیوں کہ مخدوؔم سے ان کی جدائی بہت عارضی ہے۔ صرف چند دنوں چند مہینوں کی بات۔ اسی لئے انہوں نے دوسروں کو دل کھول کر رونے کا موقع دیا اور خود ہنستے رہے۔ مخدوؔم کے جلسہ تعزیت میں اریب نے ایک مضمون پڑھا اور اس مضمون کے ردعمل کے طور پر ان پر انڈے بھی پھینکے گئے۔ اس واقعہ کے بعد اریب کے جذبات کافی تلخ ہوگے تھے اور دوستوں کے لئے بھی ان کے رویہ میں تبدیلی آ گئی تھی۔ ایک دن عابد روڈ پر نظر آئے تو مجھے دیکھ کر انجان بن گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے اریب اپنی دانست میں یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان پر انڈے میں نے ہی پھینکے تھے۔ میں نے بھی انہیں چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسی اثناء میں اسد اللہ برلن سے آ گئے اور ایک دن مجھ سے کہنے لگے ''چلو آج کی شام اریب کے ساتھ گزاریں گے۔''

میں نے کہا ''بات دراصل یہ ہے کہ اریب مجھ سے کھنچے کھنچے سے نظر آتے ہیں، جانے کیا بات ہے۔ جانا ہوتو آپ چلے جائیں۔ وہ بیمار بھی ہیں اسی لئے میں اُن کی بیماری کو مزید تلخ نہیں بنانا چاہتا۔'' مگر اسد اللہ نہ مانے، اریب کو فون کیا اور ہم تینوں ایک ''بار'' میں بیٹھ گئے۔ اریب تب بھی مجھ سے کھنچے ہوئے نظر آئے مگر اچانک انہوں نے مجھ سے مخاطب

www.urduacademyts.com

ہوکر کہا ''بھئی تم تو ہماری محفلوں میں کا جو کھانے پر اکتفا کرتے ہو، آج جی بھر کر کا جو کھالینا۔ لیکن اگر انگور کا پانی مجھ پر اثر کرے تو میری بات کا اثر نہ لینا۔''

میں نے مسکرا کر پلیٹ میں سے کا جو اُٹھا کر منہ میں ڈال لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس محفل میں کوئی گفتگو ایسی نکلے جس سے اریب کو تکلیف پہنچے۔ مگر اریب نے دو پیگ کے بعد ہی تلخ بحث چھیڑ دی۔ اریب کہنے لگے ''مجھ پر پرسوں جو انڈے پھینکے گئے کیا تم اس کو درست سمجھتے ہو؟'' میں نے بھی تڑاخ سے کہہ دیا۔ اریب صاحب انڈے پھینکنے کی بات کو درست یا نادرست سمجھنا ایک الگ بات ہے لیکن کیا یہ درست بات ہے کہ آپ مجھے انڈے پھینکنے والوں میں شامل سمجھیں؟''

میرا جملہ سنتے ہی اریب جھومتے ہوئے اپنی کرسی سے اُٹھے، مجھے گلے سے لگالیا۔ پھر ٹیبل کے نیچے سے سگریٹ کی ایک خالی ڈبیہ نکال کر مجھ سے قلم مانگا اور سگریٹ کی ڈبیہ پھاڑ کر لکھنے لگے۔

''حسین (فرزند اریب) کی قسم، صفیہ کی قسم میں نے کبھی ایسا نہیں سمجھا۔ میں تمہیں بہت بڑا مزاح نگار سمجھتا ہوں۔ تم رشید احمد صدیقی اور پطرس کا تسلسل ہو۔''

پھر اسی کاغذ کے دوسرے رُخ پر لکھنے لگے۔

''حسین کی قسم مخدومؔ سے مجھے بے حد پیار ہے۔ میں مخدوم کے خلاف کچھ لکھ ہی نہیں سکتا۔''

پھر اسی کاغذ کو میرے حوالے کر کے کہنے لگے ''لو اس کاغذ کو اپنے پاس دستاویزی ثبوت کے طور پر محفوظ رکھو۔''

میں نے کہا ''اریب صاحب! آپ نے کہہ دیا یہ بہت کافی ہے، دستاویزی ثبوت لے کر کیا کروں؟''

بولے ''دنیا دستاویزی ثبوت کے بغیر کسی سچائی کو قبول نہیں کرتی۔''

www.urduacademyts.com

پھر کوئی نزاعی بات نکلی تو اریب پھر اُٹھ کر برابر کی ٹیبل کے نیچے سے سگریٹ کی ڈبیہ تلاش کرنے لگے۔ اسد اللہ اور میں انہیں روکتے رہے۔ مگر اس دن انہوں نے اس ''بار'' میں ایک بھی خالی ڈبیہ پڑی نہ رہنے دی۔ بات بات پر دستاویزی ثبوت تقسیم کرتے رہے۔ یہاں تک کہ میں نے بیرے سے کہا کہ ''بار میں سگریٹ کی جتنی بھی خالی ڈبیاں پڑی ہوئی ہیں انہیں فوراً وہاں سے ہٹادو۔'' بیرے نے کہا ''اب میں کیا ہٹاؤں ساری ڈبیاں تو آپ کے ساتھی نے اُٹھالی ہیں۔''

اس دن کے بعد میں نے اریب کو پھر کسی بار میں نہیں دیکھا۔ پھر وہ اسپتال میں داخل ہوگئے۔ موت آہستہ آہستہ اُن کی جانب بڑھنے لگی۔ اریب موت کے قدموں کی آہٹ سے بے نیاز جاتی ہوئی زندگی کے قدموں کی چاپ سنتے رہے۔ میں اکثر اُن سے ملنے اسپتال چلا جاتا۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ کو دیکھ کر میری آنکھ میں آنسو آجاتے۔

غالباً ۲۸ر اگست ۱۹۷۰ء کو میں، کرشن چندر اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ مل کر اریب کو دیکھنے اسپتال گئے۔ اریب کے سیدھے ہاتھ پر زخم آگیا تھا اور اسی دن اسپتال میں اس کا آپریشن ہوا تھا۔ اریب پر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ بات کرنے کے قابل بھی نہیں تھے۔ کرشن چندر کے قدموں کی آہٹ سن کر انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ پھر سمندر کی ایک لہر کی طرح اریب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس وقت اریب بات نہیں کرسکتے تھے صرف مسکراسکتے تھے۔ انہوں نے غالباً یہ محسوس کیا کہ ان کے بات نہ کرنے سے کرشن چندر خفا ہوجائیں گے۔ اسی لئے انہوں نے بات نہ کرنے کا دستاویزی ثبوت فراہم کرنے کے لئے اپنے بائیں بازو سے کپڑا ہٹایا اور اپنا گہرا زخم دستاویزی ثبوت کے طور پر کرشن چندر کو دکھادیا۔ کرشن چندر کی آنکھوں میں اچانک آنسو آگئے مگر وہ ضبط کرتے رہے۔ کرشن چندر نے کہا۔'' اریب یہ تمہیں کیا ہوگیا۔ ارے بھئی یہ تو ہمارے مرنے کے دن ہیں۔ تم ہم سے بھلا آگے کیسے جاسکتے ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ کرشن چندر کا یہ جملہ سن کر اریب کی مسکراہٹ کے سمندر میں

www.urduacademyts.com

ایک طوفان سا اُٹھ گیا اور اس طوفان میں ہم سب بہہ گئے۔ اریب کے زخم کو وہ برداشت کر گئے تھے لیکن اریب کی مسکراہٹ کو برداشت کرنے کی اُن میں سکت نہیں تھی۔ وہ فوراً باہر نکل آئے اور دروازے کے سامنے ہی اچانک بیٹھ گئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور میں نے انہیں فوراً تھام لیا۔ اس وقت تو ضرورت اس بات کی تھی کہ ہم اریب کو سنبھالتے۔ کیوں کہ اریب کمرہ کے اندر اکیلے رہ گئے تھے۔ لیکن مشکل تو یہی تھی کہ اریب کا کرب خود اریب تو بڑی آسانی سے سنبھال لیتے تھے لیکن ان کا کرب کوئی دوسرا آدمی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ کرشن چندر کو برابر کے کمرہ میں لٹایا گیا اور فوراً ڈاکٹر کو طلب کیا گیا تاکہ وہ کرشن چندر کا معائنہ کرسکے۔

اب موت اریب کے بالکل قریب آگئی تھی۔ میں ہر روز صبح میں اخبار اُٹھا کر سب سے پہلے اریب کی تصویر تلاش کرتا اور جب مجھے یہ تصویر نہ ملتی تو میں حیران سارہ جاتا۔ اسی اثناء میں میرے مضامین کا دوسرا مجموعہ ''قطع کلام'' شائع ہوگیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اریب اس کتاب کو کبھی نہ پڑھ سکیں گے لیکن مجھے انہیں اپنی کتاب دینے کی بڑی جلدی تھی۔ ۶/ستمبر کی رات کو میں اپنی کتاب دینے کے لئے اریب کے پاس گیا۔ ان کی زندگی میں اب صرف چند گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ مجھے بڑی نقاہت سے دیکھا۔ آنکھوں آنکھوں میں کتاب کے لئے شکریہ ادا کیا۔ پھر اشارہ سے بتایا کہ وہ کچھ پڑھنے کے قابل نہیں ہیں۔ مجھے اشارہ کیا کہ میں کتاب کو کھولوں۔ میں نے کتاب کا پہلا ورق پلٹا۔ ہاتھ کے اشارے سے پوچھا کیا لکھا ہے؟

میں نے زور سے کہا ''اریب صاحب! یہ میری کتاب کا ''پس و پیش لفظ'' ہے۔ سب لوگ ''پیش لفظ'' لکھتے ہیں مگر میں نے 'پس و پیش لفظ' لکھا ہے۔''

یہ سنتے ہی اریب کے کمزور، نحیف اور خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ بڑی دور تک پھیل گئی اتنی دور تک کہ جب مسکراہٹ ختم ہوگئی تو اریب کو اپنے ہونٹ پھر اپنی جگہ پر لانے میں بڑی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ پھیلی ہوئی مسکراہٹ اب بھی کبھی واپس نہ

www.urduacademyts.com

ہوگی جیسے یہ مسکراہٹ سمندر کی لہر بن کر ایک انجان سفر پر روانہ ہوگئی ہے۔ اریب کی یہ مسکراہٹ میرے دل میں ایک خنجر کی طرح اتر گئی۔ میں چپ چاپ اس خنجر کو اپنے دل میں چھپائے اور اریب کے ہونٹوں پر اپنی دی ہوئی مسکراہٹ کو جوں کا توں چھوڑ کر کمرہ سے باہر نکل آیا۔ اور اس کے چند گھنٹوں بعد اریب اس دنیا سے چلے گئے۔

میں نے اریب کو غالبًا اس دنیا کی آخری مسکراہٹ دی تھی اور یہ آخری مسکراہٹ ابھی تک میری آنکھوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اریب کے ہونٹوں سے یہ آخری مسکراہٹ چھین لوں اور اریب سے کہوں :

''اریب صاحب! میری دی ہوئی مسکراہٹ مجھے واپس کر دیجئے ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ میں آپ کو مسکراہٹ عطا کروں اور آپ میرے سینے میں خنجر اُتار دیں۔'' میں سچ مچ اریب سے یہ آخری مسکراہٹ چھین لینا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ اریب کی زندگی کی غالبًا یہ پہلی اور آخری مسکراہٹ تھی جس میں اریب کی زندگی کا سارا درد اور سارا کرب سمٹ آیا تھا۔ مجھے یوں معلوم ہوا تھا جیسے اریب کے ہونٹوں سے ان کی آنکھیں ٹپا ٹپ ٹپکنے لگی ہیں اور زندگی قطرہ قطرہ بنکر خشک ہونے لگی ہے۔

☆☆☆

مرتبہ شعبۂ اُردو، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

عثمانیہ یونیورسٹی